محمد مظہر الدین صدیقی

(رفیق ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ)

مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ - لاہور

(پاکستان)

۱۹۵۱ء

فہرست مضامین

حصہ اول

حصہ دوم

"اسلام کا نظریۂ تاریخ" دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّہ میں تاریخی واقعات و انقلابات کے متعلق قرآن کے عام اندازِ فکر کی تشریح کی گئی ہے۔ اور پھر تفصیلی طور سے بتایا گیا ہے کہ قوموں کی بربادی کن قوانین اور اصولوں کے تحت عمل میں آتی ہے نیز قرآن نے زوال پذیر اقوام و طبقات کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں۔ دوسرے حصّہ میں پہلے رومی تہذیب کے دورِ زوال کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد فرانس، امریکہ اور انگلستان کی حالیہ تاریخ سے جستہ جستہ واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے ان قوموں کے اسبابِ زوال پر روشنی پڑتی ہے۔ آخری باب میں روما اور جدید یورپ و امریکہ کی تاریخ سے نتائج مستنبط کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ اصولِ تاریخ، صرف گذشتہ اقوام کے لئے ہی نہیں، بلکہ موجودہ قوموں کے لئے بھی صحیح ہیں ٭

محمد مظہر الدین صدیقی

(رفیقِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور)

۲۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء

اسلام کا نظریۂ تاریخ

حصہ اوّل

تمہید

افراد اور اقوام کی زندگی میں جو انقلابات اور تغیرات واقع ہوتے ہیں، اُن سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے، کہ انسان اپنے مستقبل کی تعمیر و تشکیل اور اپنی قسمت کے بناؤ بگاڑ پر قادر نہیں ہر فرد اور ہر قوم کی یہ کوشش ہوتی ہے، کہ اگر وہ اپنی موجودہ حالت سے آگے کی جانب قدم نہ بڑھا سکے، تو کم سے کم پیچھے ہٹنے پر بھی مجبور نہ ہو، اگر ترقی اور اصلاح کے منازل نہ طے کر سکے، تو اپنے آپ کو پستی اور ذلت ہی سے محفوظ رکھے۔ لیکن اس قسم کی کوششیں بارہا ناکام بھی ہو جاتی ہیں۔ افراد پر خوشحالی اور آسودگی کے بعد اکثر اوقات تنگی اور افلاس کا دور آ جاتا ہے، قومیں عروج و ترقی اور آزادی کے بعد محکومی، ذلت اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہو جاتی ہیں، ایسی تغیرِ حال اور انقلابِ کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ	اور یہ زمانہ کے انقلابات ہیں جن کو ہم لوگوں میں گردش دیتے رہتے ہیں۔
اِنَّ مَعَ الْيُسْرِ عُسْرًا	آسودگی اور خوشحالی کے ساتھ تنگی اور افلاس بھی لگے ہوئے ہیں
وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۔	اور ہم نے ارادہ کیا، کہ جو لوگ دنیا میں ذلیل و حقیر سمجھے جاتے ہیں انہیں اقوامِ عالم کا لیڈر بنا دیں، اور انہیں وراثتِ ارضی عطا کریں۔

لیکن جب کسی گروہ، قوم یا خاندان پر خوشحالی اور قوت و اقتدار کا ایک طویل دور گزر جاتا ہے تو اس کے افراد اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ باقی رہے گی، اور ہماری دولت و قوت اور طاقت و اقتدار اتنی مستحکم اور محفوظ بنیادوں پر استوار ہے، کہ اب اس کے زوال یا خاتمہ کا کوئی اندیشہ اور امکان نہیں ۔ مگر یہ پندار و غرور بھی بالآخر تاریخ کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے۔ آسودہ حال افراد تباہ و برباد اور طاقت و اقتدار کے اجارہ دار ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل تاریخ کے انقلابی ادوار میں اتنا نمایاں اور متواتر ہوتا ہے، کہ کوئی فرد و قوم اپنے آپ کو اس سے مامون و محفوظ نہیں سمجھ سکتی ۔ البتہ امن و عافیت اور تہذیبوں کے عروج و استحکام کے زمانہ میں انقلابی اُتار چڑھاؤ کا یہ عمل سُست رفتار ہوتا ہے، اس لئے خوشحال افراد، ذی اثر خاندان اور جاہ و اقتدار رکھنے والے طبقے مکافاتِ عمل اور جزا و سزا کے قانون کی خاموش رفتار اور غیر محسوس مصروفیت سے دھوکہ کھا کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے اعمال کا کوئی حساب لینے والا نہیں ہے۔ اور ہم جو چاہیں کریں۔ ہمیں کوئی طاقت اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتی ۔ حالانکہ ان کے اعمال ناگزیر طور پر ان کی تباہی کے اسباب جمع کرتے رہتے ہیں۔ قدرت کے اسی قانونِ مکافات اور تاریخ کی اسی انتقامی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ حکیم فرماتا ہے :—

وما اللّٰہ بغافلٍ عمّا تعملون ۔	(یہ نہ سمجھو کہ) اللہ (کا قانون جزا و سزا) تمہارے اعمال کی طرف سے غافل ہے ۔
ولا تحسبنّ اللّٰہ غافلاً عمّا یعملون الظّالمون انّما یؤخّرھم لیومٍ تشخص فیہ الابصار ۔	یہ گمان (ہرگز) نہ کرنا کہ اللہ (کا قانون جزا و سزا) ظالموں کے اعمال کی طرف سے غافل ہے بلکہ وہ ان اعمال کے نتائج کو اس روز تک مؤخر کر دیتا ہے جب انسان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی

افرادِ انسانی کی بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ اس کی دنیوی خوشحالی اور مادی ترقی کا دارومدار اس کی اپنی سعی و کوشش پر ہے۔ قوم کی تقدیر کے بناؤ یا بگاڑ سے ہماری ذاتی فلاح و بہبود کا جو گہرا تعلق ہے اکثر اوقات ہم اُسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ غلط فہمی بھی لوگوں کو اسی زمانہ میں پیدا ہوتی ہے۔ جب قوم اپنی ابتدائی جدوجہد و سعی بقاء کے بعد ہر قسم

کے خطرات و آفات سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس کی ترقی اور خوشحالی کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایسے
زمانہ میں لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے اپنے ذاتی مقاصد، شخصی اور
خاندانی مفادات اور اپنی اپنی خواہشات کی قربانی کر کے اجتماعی ایثار اور اعمالِ صالحہ کے ذریعہ
امن و عافیت اور ترقی اور خوشحالی کے مواقع پیدا کئے تھے۔ اور اگر ہم اس امن و عافیت اور ان
مواقع ترقی کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں ذاتی ترقی اور بڑائی یا خاندانی مرفہ الحالی کی دوڑ
میں اتنا منہمک نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم قوم کی تقدیر اور اس کے مستقبل کی طرف سے بالکل غافل
اور لاپرواہ ہو جائیں۔ اور اپنی قوت اور مال و دولت کو صرف ذاتی اور خاندانی اغراض پر صرف
کرتے رہیں۔ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ جب قوم کا اجتماعی وجود محفوظ ہو جاتا ہے تو لوگ اپنی
ذاتی ترقی اور بڑائی کی دھن میں قومی اغراض اور اجتماعی مفادات کے لئے قربانی کرنے سے گریز کرنے
لگتے ہیں۔ ان کی شخصی تقدیر اور ان کے ذاتی مستقبل کا قومی تقدیر سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے اُسے
بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ اپنی اپنی خواہشات۔ فوری منافع اور عیش و راحت کی ہوس میں
اتنا گرفتار ہو جاتے ہیں، کہ ضمیر و اخلاق کے تقاضوں اور بلند تر اجتماعی مقاصد کے لئے تکلیف
اُٹھانے کا خیال بھی اُن پر گراں گزرنے لگتا ہے۔ پھر جب ان خود غرضیوں، غفلتوں اور بداعمالیوں
کے باعث قوم کسی سخت اقتصادی آفت یا سیاسی بحران میں مبتلا ہو جاتی ہے یا اس پر اور کوئی بڑی
تباہی نازل ہوتی ہے۔ تو افراد کی تقدیریں بھی اس تغیرِ حال کے ساتھ بدلتی ہیں، مرفہ الحال تاجر
مفلس و قلاش ہو جاتے ہیں بے شمار اہلِ صنعت کساد بازاری کی وجہ سے نقصان اُٹھاتے ہیں
متوسط الحال افراد بیروزگاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہر خاندان کی آمدنیاں دفعتہً گھٹنے لگتی
ہیں۔ اگر قوم اپنی مسلسل بدکرداریوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے کسی دوسری ملکی طاقت سے،
شکست کھا جاتی ہے، تو اس کا حکمران طبقہ اچانک مقامِ عزت سے قعرِ مذلت میں گر جاتا ہے اس
کے تعلیمیافتہ اور ذہین افراد، اس کے عہدہ داران نظم و نسق اس کے ماہرین فن، تاجر، صناع صحافی
اور اہلِ قلم سب کے سب اپنی سابقہ حیثیت کھو بیٹھتے ہیں، اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو
جاتے ہیں۔ اس وقت لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی قسمتیں قوم کی قسمت کے ساتھ وابستہ ہیں
اور جب تک قوم بحیثیت مجموعی طاقتور اور ترقی پذیر نہ ہو کوئی فرد محض اپنی ذاتی محنت یا جدوجہد

سے مقامِ عزت یا وسائلِ دولت حاصل نہیں کر سکتا۔

لیکن افراد کی ذاتی قسمت اور قوم کی اجتماعی تقدیر کی اس باہمی وابستگی کا احساس بھی لوگوں کو اپنی پستی، ذلت اور تباہی کے حقیقی اسباب سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ اگر اس قسم کی اجتماعی آفت یا شکست کی وجہ سے قوم کے مجموعی طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ جب قوم اس قسم کے کسی سیاسی یا اقتصادی بحران میں مبتلا ہوتی ہے یا اسے کوئی دوسری طاقتور قوم مغلوب و مفتوح کر لیتی ہے تو قوم کے اکثر و بیشتر افراد اس تباہی کو کسی ایسے سبب پر محمول کرتے ہیں جس کا اس کے حقیقی سبب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے فوجی جنرلوں کی اجتہادی غلطی سے ہمیں شکست اٹھانی پڑی۔ کبھی ساز و سامان کی قلت اور آبادی کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اقتصادی اسباب کی جستجو کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معاشی حالات کی خرابی سے یہ بحران واقع ہوا۔ اگر بینک کاری (Banking) کا نظام فلاں فلاں اصولوں پر قائم ہوتا، تو یہ اقتصادی تباہی نہ آتی، اگر زر اور تسکیک (Money and Coinage) کے بارے میں ہماری پالیسی فلاں فلاں نقائص سے پاک ہوتی تو ہم ان آفات سے محفوظ رہتے، غرضیکہ یا تو جزوی اور ظاہری اسباب (Partial and Apparent Causes) کو حقیقی اسباب قرار دیا جاتا ہے یا دشمنوں اور مخالفین کو اس شکست و تباہی کے لئے مورد الزام قرار دے کر اپنی اور اپنی قوم کی کمزوریوں اور فروگذاشتوں پر پردہ ڈال لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض لوگ اس قسم کی تباہی کو محض اتفاقی حوادث کہہ کر ٹال دیتے ہیں کیونکہ ان کی قوتِ فکر اتنی پختہ نہیں ہوتی کہ وہ واقعات کی صحیح علت تلاش کریں۔ اس قسم کے کمزور فکر والے لوگ اگر ان پر مذہبی رنگ غالب ہے تو وہ اپنی تباہیوں اور آفتوں کا الزام مشیتِ الٰہی کے سر تھوپ دیتے ہیں اور واقعات کے اسباب و علل کی جستجو سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ مشیتِ الٰہی یوں ہی تھی۔ کارکنانِ قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا۔ گویا کہ عالمِ تاریخ اور عالمِ فطرت میں کوئی اندھی، بہری مشیت کارفرما ہے جس کا نہ کوئی اصول ہے اور نہ قانون و آئین ❊

مشیتِ الٰہی اور قوانینِ تاریخ

اس میں شک نہیں کہ واقعات تاریخ اور حوادثِ فطرت میں ایک گہری مشیّت کارفرما ہے
جسے اہل مذہب مشیتِ الٰہی اور مادیین مشیّت تاریخ (Will of History)
کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ مشیّت اسباب و علل کے واسطہ سے کام کرتی ہے اور اس کے
مستقل قوانین ہیں جن کی وہ کبھی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ یہ خیال بنیادی طور پر غلط ہے
کہ مشیتِ الٰہی کوئی اندھی بہری قوت ہے جس کے اُصول و قوانین غیر معیّن اور نامعلوم ہیں۔
قرآنِ حکیم نے اس غلط تصور مشیّت کی پرزور تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خُداوند تعالیٰ
کا کوئی کام بلا سبب یا بلا مصلحت نہیں ہوا کرتا۔۔ کیونکہ اُس نے اس کائنات کو چند معیّنہ
اُصولوں پر بنایا ہے اور انہیں اُصولوں کی پابندی کر کے قومیں طبعی فطرت ......
(Physical Nature) اور انقلابات تاریخ پر قابو پاسکتی ہیں۔ خُدا کے
غضب و انتقام اور اس کی خوشنودی اور رضامندی کا بھی ایک آئین اور ضابطہ ہے۔ یہ بات صحیح
نہیں... کہ خُداوند تعالیٰ کسی قوم کو بلاوجہ اپنے انعامات و اکرامات سے سرفراز کر دیتا ہے یا بغیر
کسی قصور اور گناہ کے ان کو آفات و مصائب میں مُبتلا کر دیتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

وَمَا کُنَّا مُھلِکَ القُریٰ اِلّا وَ اَھلُھَا ظَالِمُون۔	ہم کسی آبادی (قوم) کو ہلاک نہیں کرتے ہیں بجز اس کے کہ اس کے افراد ظالم ہوں۔
وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُھلِکَ القُریٰ بِظُلمٍ وَاَھلُھَا مُصلِحُون۔	تیرا رب کسی آبادی (قوم) کو ظلم کے ساتھ برباد نہیں کرتا ہے جبکہ اس کے افراد نیک کردار ہوں۔
ذَالِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَم یَکُ	اللہ تعالیٰ کسی قوم سے اپنی عطا کردہ نعمتیں نہیں

مغیراً نعمۃً انعمہا علیٰ قومٍ حتّٰی یُغیّروا ما بانفسِہم۔	چھینتا ہے، جب تک کہ وہ قوم اپنا عمل اور کردار خود نہیں بدلتی۔

اِن آیات میں یہ بتا دیا گیا ہے، کہ تاریخی واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال اور عزّت و ذلّت کے مظاہر افراد کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہیں۔ خدا کسی قوم کو اسی صورت میں برباد کرتا ہے یا یوں کہئے، کہ قانونِ الٰہی اور قانونِ فطرت کسی قوم کو اس کی آزادی اور طاقت سے اسی وقت محروم کرتا ہے جب وہ کمزوروں پر ظلم کرنے لگتی ہے، خواہ یہ کمزور لوگ کسی دوسری محکوم قوم کے افراد ہوں، یا خود اسی قوم کے غریب اور بے سہارا لوگ ہوں، اسی طرح جس قوم کے اعمال اچھے ہوں، اور جو کمزور انسانوں کے حقوق کا احترام کرتی ہو، یا قرآنی اصطلاح میں صالح ہو، اس کو خداوند تعالیٰ کسی مصیبت میں نہیں مبتلا کرتا۔۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ اجتماعی اعمال کی جزا و سزا ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے، جس کا مشاہدہ تم تاریخ کے ہر عہد انقلاب میں کر سکتے ہو۔ اگر تم قوموں کے عروج و زوال اور عزّت و ذلّت کا حقیقی سبب معلوم کرنا چاہتے ہو، تو تاریخ کی ورق گردانی کرو، اور تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں، ان کا حال معلوم کرو۔

فھل ینظرون اِلّا سنّت الاوّلین فلن تجدَ لِسنّتِ اللہِ تبدیلاً ولن تجدَ لِسنّتِ اللہِ تحویلاً۔ اَولم یسیروا فِی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃُ الذین من قبلِہم وکانوا اشدَّ منہم قوّۃً۔	تو کیا یہ پہلے لوگوں کے طریق تباہی کے سوا اور کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے، تو اللہ کے طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا، اور تو اللہ کے طریقہ میں الٹ پھیر نہ پائیگا۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے پہلوں کا کیا انجام ہوا، جو ان سے قوّت میں بہت زیادہ تھے۔

قرآن کریم نے یہاں مطالعہ تاریخ کے بجائے گزشتہ قوموں کا حال معلوم کرنے کے لئے سیر و سیاحت کے طریقہ کا ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ گزشتہ زمانے میں قوموں کی مفصّل تواریخ مرتب نہیں تھیں، اور ان کے تاریخی حالات معلوم کرنے کا یہی طریقہ تھا، کہ لوگ ان مقامات کی سیر و سیاحت کریں، جہاں پہلے یہ قومیں آباد تھیں، اس لئے قرآن کی عبارت میں سیر سیاحت کے بجائے اگر مطالعہ تاریخ کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو مطلب میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ بہرحال

قرآن کا دعویٰ یہ ہے، کہ کسی ذریعہ سے تم واقعاتِ تاریخ سے واقفیت حاصل کرلو، تو تمہیں محسوس ہوگا، کہ اجتماعی جزاو سزا اور مکافاتِ عمل کا تاریخی قانون ایک اٹل، مستقل اور ناقابلِ تغیّر قانون ہے اور تاریخ کے اس قانون یا بالفاظ قرآن سنّتِ الٰہی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ جو قومیں خوشحالی اور عظمت و عزّت کی بلندی سے محکومی، پستی اور ذلّت میں مبتلا ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ خدا ان کی حالت کو بدل دیتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی روش اور طرزِ عمل میں خود تبدیلی پیدا کر کے اپنی ذلّت و ناکامی کے اسباب فراہم کرتی ہیں۔ کوئی بڑھتی ہوئی قوم جن خدائی انعامات و اکرامات سے سرفراز ہوتی ہے، وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستفید ہو سکتی ہے اگر اس کی وہ ابتدائی روش، وہ طرزِ فکر و طریقِ حیات تبدیل نہ ہو، جو ان انعامات اور سرفرازیوں کا باعث تھا۔ اس طرح قرآن اس نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ کہ خدا کی مشیت نامعلوم ہے یا وہ کوئی راز ہے۔ جسے انسان سمجھ نہیں سکتا ہے۔ وہ اس خیال کی بھی تردید کرتا ہے۔ کہ اللہ کی مشیّت کا کوئی اُصول نہیں۔ اور وہ بغیر کسی سبب و علّت یا مصلحت کے کوئی کام کرتا ہے، یا یہ کہ وہ اپنی داد و دہش اور غضب و انتقام میں کسی ضابطہ اور آئین کا پابند نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو انسان اس ضابطہ کو معلوم کرنے سے عاجز ہے۔ پھر قرآن کے اس دعویٰ سے کہ ہم کسی قوم کی ترقّی اور خوشحالی کو ذلّت و پستی میں نہیں بدلتے ہیں یہ امر بھی مستنبط ہوتا ہے۔ کہ تاریخ کی تبدیلیاں اور اجتماعی انقلابات و حوادث براہِ راست خدا کی مرضی سے ظہور پذیر نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان انقلابات و تغیّرات کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ جس کا سراغ انسان کو خود اپنے اعمال میں تلاش کرنا چاہیئے۔

جو لوگ تاریخی انقلابات اور قوموں کے عروج و زوال اور عظمت و ذلّت کو وقتی حالات اتفاقی حوادث، جغرافیائی عوامل یا خداوند تعالیٰ کی نامعلوم مشیّت پر محمول کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں، کہ خود اپنی زندگی کے روزمرّہ واقعات میں وہ خدا کی نامعلوم مشیّت پر بھروسہ کرنے کے بجائے ان واقعات کے اسباب و علل کی جستجو کرتے ہیں۔ اور پھر اپنے مفید مطلب اسباب و وسائل فراہم کر کے نقصان سے محفوظ رہنے اور کامیابی حاصل کرنے کی جدّوجہد کرتے ہیں، مثلاً جب ہم کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو ہم یہ کہہ کر بیٹھے نہیں رہتے۔ کہ خدا کی مشیّت یونہی تھی اس کے بجائے ہم اپنے اسباب مرض کی تلاش کرتے ہیں دیکھتے ہیں کہ کہیں ہم نے بد پرہیزی تو

نہیں کی تھی۔ اُصولِ حفظانِ صحت کی خلاف ورزی کا ارتکاب تو ہم سے نہیں ہوا۔ پھر جب غور و
فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہماری علالت اور جسمانی تکلیف کی اصل علت یہ تھی کہ ہم نے
فلاں فلاں اُصولِ صحت کے خلاف عمل کیا۔ ہمارے سونے اور اُٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے کے اوقات
ٹھیک نہ تھے یا ہم نے غذاؤں کے انتخاب میں غلطی کی تو اس وقت ہم اپنی روش اور طرزِ عمل میں
تبدیلی پیدا کر کے ازالہ مرض کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے مکان کا کوئی کمرہ دفعتہً گر جاتا ہے تو
ہم یہ نہیں کہتے کہ خُدا نے اسے گرا دیا، یا اللہ کی مشیّت یونہی تھی اس کے بجائے ہم فوراً سوچتے
ہیں کہ جس انجینئر نے مکان کا نقشہ مرتب کیا تھا اس کے حساب میں کوئی غلطی رہ گئی ہوگی یا تعمیر
مکان کا انتظام جن لوگوں کے سپرد تھا، انہوں نے انجینئر کے مرتب کردہ نقشہ کے مطابق کام
نہیں کیا، یا یہ کہ منتظمین نے تعمیرِ مکان کے لئے سامان خریدنے میں کچھ خیانت کی ہوگی۔ اور گھٹیا
قسم کا مال استعمال کیا ہوگا۔ غرضیکہ معمولی واقعات جن کا ہماری شخصی یا خاندانی زندگی سے تعلق
ہوتا ہے ہم اس طرح غور نہیں کرتے ہیں کہ گویا یہ کسی نامعلوم مشیّت کا نتیجہ ہیں بلکہ انکے اسباب و
علل کی جستجو کر کے ہم ان واقعات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قومی زندگی کے اُتار چڑھاؤ
تاریخ کے واقعات و حوادث اور اپنے مُلکی انقلابات اور اجتماعی مصائب کے بارے میں ہم ایک
بالکل مختلف طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں، اور اپنی غلطیوں، خطاؤں اور فروگذاشتوں کا جائزہ لینے کے
بجائے ہم یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ خُدا کی مشیّت یونہی تھی، حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف الفاظ
میں ارشاد فرمایا ہے :—

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا
نِعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى
يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔

یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو کسی قوم سے کبھی نہیں
چھینتا جو اسے اللہ کی طرف سے ملی ہوں جب تک
کہ وہ قوم خود اپنے عمل اور کردار کو نہ بدل دے۔

پس معلوم ہوا کہ واقعاتِ تاریخ اور انقلاباتِ عالمِ انسان کے اپنے اعمال کا براہِ راست
نتیجہ ہیں۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی مداخلت کا۔ تاریخ خود اپنے مستقل قوانین رکھتی ہے، جن میں سب سے بڑا
اور بنیادی قانون مکافاتِ عمل کا ہے یعنی اجتماعی اعمال کے نتائج خواہ وہ بُرے ہوں یا
اچھے اپنے مقررہ وقت پر ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ جس طرح فطرتِ مادّی میں۔ (

(Conservation of matter and motion) کے قانون کے مطابق ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی مادّی شئے یا ذرّاتی حرکت ضائع نہیں ہوتی اسی طرح فطرت اجتماعی اور عالم روحانی میں انسان کا کوئی اچھا یا بُرا عمل بے اثر اور بے نتیجہ نہیں رہتا ہے بلکہ ہر عمل کا نتیجہ ایک خاص وقت ضرور ظاہر ہوتا ہے کیونکہ فطرت میں کہیں ضیاع نہیں ۔ ۔ چنانچہ قرآن جس طرح بداعمالی کے نتائج سے ڈراتا اور یقین دلاتا ہے کہ بدی کے نتائج سے بچنا محال ہے اسی طرح اس کا یہ بھی دعویٰ ہے ۔ کہ نیک اعمال اور اعلیٰ اجتماعی کردار بھی بے نتیجہ نہیں ہو سکتا ہے ۔ اور کوئی اچھی قوم اپنی صالح جدّ و جہد کے عمدہ نتائج یا اس کے اجر سے محروم نہیں رہے گی ؛ ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجرَ الْمُحْسِنِين ۔	اللہ تعالیٰ نیکی کرنیوالوں (یعنی صالح قوم) کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے ۔
ولو انّ اهلَ القریٰ امنوا واتقو لفتحنا علیهم برکاتٍ من السماء والارض ولکن کذّبو فاخذنٰهم بما کانو یکسبُون ۔	اگر ان آبادیوں کے باشندے ایمان لاتے اور خدا کے قانون جزا و سزا سے ڈرتے رہتے تو ہم آسمان کی ان پر برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے خدا کے قانون جزا و سزا کا انکار کیا تو ہم نے انہیں ان کاموں کی سزا دی جو وہ کیا کرتے تھے

ان دونوں آیات میں قرآن کریم نے قوانین تاریخ کی نہایت جامع اور مکمل الفاظ میں توضیح کر دی ہے ۔ اوّلاً وہ کہتا ہے کہ اچھے اعمال کے نتائج اسی دُنیوی زندگی میں تمہارے سامنے آجاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نیک کرداری اور حسن عمل کے نتائج کو ضائع نہیں کرتا ۔ اگر لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو یعنی وہ انسان کی اجتماعی فطرت کا صحیح علم رکھتے ہوں حقیقت حیات سے آگاہ اور باخبر ہوں نیز قانون مکافات عمل کی خلاف ورزی کے نتائج کا خوف بھی ان میں موجود ہو جسے قرآن اپنی اصطلاح میں تقویٰ کہتا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ زوال و انحطاط یا ذلّت و نکبت میں مبتلا ہو جائیں بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں زمین و آسمان کی برکات یعنی مادّی وسائل کی فراوانی سے مالا مال اور خوشحال کر دیگا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی عظمت و کامیابی اور خوشحالی افراد کے اجتماعی عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ اندھی بہری تقدیر کا ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کائنات اور انسانی زندگی کی تعمیر اللہ تعالیٰ نے قانونِ اخلاق پر کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ انہیں قوموں کو دنیوی عزّت و سربلندی اور حکومت عطا فرماتا

سے سرفراز فرماتا ہے، جن کا وجود پسماندہ اقوام اور مظلوم طبقات کے لئے فائدہ مند ہو۔ جو اپنی عقلی ترقی، سائنٹفک برتری اپنے عدل و انصاف اور جذبہ احترام انسانیت کے باعث پست اور ذلیل قوموں نیز پسماندہ طبقات کو رفعت و بلندی کی طرف لے جاسکیں اور اخلاقی یا تمدنی حیثیت سے انہیں آگے بڑھا سکیں۔ ظالم اور عیش پرست قومیں اپنی ناانصافیوں اور راحت طلبی کی وجہ سے انسانیت کو آگے بڑھانے کے بجائے اُسے پیچھے دھکیل دیتی ہیں، اس لئے قدرت ان کے وجود کو ایک بار گراں سمجھ کر اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ کیونکہ اس کو انسانیت کا ارتقاء مطلوب ہے، نہ کہ اس کی پستی۔
چنانچہ اسی فلسفہ کو قرآن ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :۔

انزل من السماءِ ماءً فسالت اودیۃٌ	وہ بادل سے پانی اُتارتا ہے پھر نالے اپنے اپنے اندازے
بقدرھا فاحتمل السیلُ زبدًا رابیًا۔	کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پھر سیلاب اُس پر تیرنے والے جھاگ کو
ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاءَ حلیۃٍ	بہا لے جاتا ہے اور زیور یا سامان بنانے کے لئے جو کچھ
او متاعٍ زبدٌ مثلہُ۔ کذالِکَ	آگ میں تپایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے
یضربُ اللّٰہُ الحقَّ والباطلَ۔ فاما الزبدُ	اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے۔ سو جھاگ تو
فیذھب جفاءً واما ما ینفعُ النّاسَ	ضائع کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ پانی جو لوگوں کو نفع پہنچاتا
فیمکثُ فی الارضِ۔	ہے۔ زمین میں باقی رہتا ہے۔

قرآن کریم نے یہاں کنایتہً یہ بتا دیا ہے۔ کہ وہی قومیں دُنیا میں بقاء و استحکام اور شرف و عزت حاصل کرتی ہیں، جن سے عام انسانیت کو نفع پہنچے، اور جن کا وجود نفع خلائق کا موجب ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی قومیں وہی ہوں گی، جو عقل و خرد سے بہرہ ور اور جذبۂ انسانیت سے معمور ہوں، جو عیش و راحت سے کنارہ کش اور جفاکشی اور محنت و مشقت، فعالیّت اور حرکت پذیری کی صفات سے متصف ہوں۔ یہی وہ اخلاقی قانون ہے۔ جو ساری تاریخ کی تشکیل کرتا ہے، اور جس کے مطابق قوموں کو عروج و ترقی یا ذلّت و نکبت نصیب ہوتی ہے۔ جو قومیں اس قانون کے مطابق شعوری طور سے یا غیر شعوری طریقہ سے عمل کرتی ہیں، ان کو اس کا انعام ملتا ہے، اور جو اس کی خلاف ورزی کرتی ہیں، انہیں اپنے کئے کی سزا ملتی ہے، چنانچہ قرآن کہتا ہے، کہ ہم نے اہل قریٰ (بستیوں) والوں سے جو مواخذہ کیا، وہ انہیں کے کسب (عمل) کا نتیجہ تھا۔ اگر ان میں محنت و مشقت، جدوجہد

عدل و انصاف اور دوسری منفعت بخش صفات ناپید نہ ہو جاتیں اور وہ تقویٰ یعنی قانونِ مکافات عمل کے نتائج کے خوف سے عاری نہ ہو جاتے تو ان کی مادی خوشحالی اور دنیوی عزت کا دور ختم نہ ہوتا، خدا کو ان کے ساتھ کوئی خصومت نہ تھی بلکہ انکی تباہی قانون تاریخ کے مطابق عمل میں آئی۔ اسی حقیقت کو قرآن یوں بھی بیان کرتا ہے: —

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا ‏ گزری ہوئی اُمتوں کے لئے وہ تھا جو اُنہوں نے
مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ — ‏ حاصل کیا اور تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم حاصل کرو گے۔

اس آیت سے ہمارے اس دعویٰ کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ قرآن کی نظر میں قوموں کی فلاح و ترقی اور زوال و ناکامی اُن کے اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ براہ راست کسی قوم کی تقدیر کو نہ بناتا ہے نہ بگاڑتا ہے، البتہ یہ بات صحیح ہے کہ مکافات عمل کا قانون جسکے مطابق اعمال کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے۔ اس لئے اس قانون کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے چنانچہ جب وہ کہتا ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلت وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ، تو اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ ہمارے بنائے ہوئے قانونِ فطرت اور قانونِ اخلاق کے مطابق جو قوم عمل کرتی ہے اس کا انجام اچھا ہوتا ہے۔ اور وہ عزت و عظمت کی زندگی بسر کرتی ہے اس کے برخلاف جو قوم قانونِ فطرت اور قانونِ اخلاق کی خلاف ورزی کرتی ہے اُسے ذلت اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس آیت کا عام طور پر مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ خدا وند تعالیٰ بغیر کسی سبب اور بلا کسی علت کے جس قوم کو چاہتا ہے معزز کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے۔ ذلیل کرتا ہے، حالانکہ یہ مفہوم دوسری آیات کی روشنی میں بالکل غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ قوموں کا عروج و زوال اور ان کا ذلیل یا عزت دار ہونا، ایک فطری قانون کا تابع ہے۔ اور اس قانون کے عمل میں اللہ تعالیٰ براہِ راست کبھی مداخلت نہیں کرتا۔

الغرض قرآن کے نزدیک واقعاتِ تاریخ میں ایک تسلسل، وحدت اور باہمی ربط و علاقہ ہے، اور تاریخ بے ربط اور بے معنی واقعات کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ہر واقعہ اپنے پیشرو واقعات سے تشکیل پاتا ہے۔ علت و معلول کے طبعی قانون کی طرح عالم تاریخ میں بھی اسباب و نتائج

کا قانون کام کرتا رہتا ہے البتہ طبعی فطرت کے واقعات مادّہ یعنی بیجان اشیاء کے خواص وصفات سے
ظہور پذیر ہوتے ہیں اور عالمِ تاریخ کے واقعات انسان کی اجتماعی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر
انسانی فطرت کے قوانین کا ہمیں صحیح علم ہو تو ہم واقعاتِ تاریخ کی توجیہہ صحیح طور سے کر سکتے ہیں
اور اگر انسانی فطرت کی خصوصیات وصفات کے متعلق ہمارے تصوّرات ناقص یا غلط ہوں تو ہم
اجتماعی واقعات اور تاریخی انقلابات کی جو توجیہہ کریں گے وہ بھی اسی درجہ میں ناقص یا غلط ہوگی۔ چنانچہ
انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں جس قوم اور گروہ کا تصوّر حقیقت سے جتنا قریب تر ہوتا ہے واقعات
کے اسباب و نتائج پر اس کی نظر بھی اتنی ہی صحیح ہوتی ہے اور اسی درجہ میں اسکو یہ قدرت بھی حاصل
ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی اعمال کا جائزہ لیکر اُن کی اصلاح کرے۔ اِس کے برخلاف جو گروہ
جس درجہ میں انسانی فطرت کے صحیح تصوّر سے عاری ہوتا ہے اسی قدر اس کا کردار اور عمل قانون
اخلاق کے منافی ہوتا ہے اور اسی حد تک وہ اپنے اعمال کی اصلاح و درستگی میں بھی ناکام رہتا ہے
اس طرح تاریخی انقلابات کا تار و پود قوموں کے اجتماعی اعمال سے بنتا ہے اور ان اعمال کا دارومدار
اس پر ہے کہ قوم کا تصوّرِ حقیقت ٹھیک ہو۔ انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں وہ صحیح نقطۂ
نظر اختیار کرے اور اپنے اعمال کی اصلاح و تحسین میں وہ اس فطرت کے تقاضوں کو مدّنظر رکھے
قرآن انہیں دونوں باتوں کو ایمان اور عمل صالح سے موسوم کرتا ہے۔ ایمان کے معنے یہ ہیں کہ
حقیقتِ حیات کے بارے میں (جس میں انسان کی اجتماعی فطرت بھی شامل ہے) ہمارا عقیدہ اور
نظریہ صحیح ہو اور عمل صالح یہ ہے کہ حقیقتِ حیات اور فطرتِ اجتماعی کے صحیح نظریہ کو مان کر
اور غلط تصوّرات سے دستبردار ہو کر ہم اپنے اجتماعی اعمال کو اس اجتماعی نظریہ اور سچّے
عقیدہ پر ڈھالنے کی کوشش کریں ۔

قرآن اور فطرتِ اجتماعی

اب سوال یہ ہے کہ قرآن اور اسلام انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں کیا نظریہ قائم کرتا ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے۔ تو واقعات تاریخ کی قرآنی توجیہہ بھی صحیح ہوگی، ورنہ نہیں کیونکہ تاریخ انسان کی فطرتِ اجتماعی کا آئینہ ہے اور اس کے تمام واقعات انقلابات اسی فطرت کے تخم سے پھوٹتے اور بڑھتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ فطرت انسانی فطرتِ الٰہی پر مبنی اور غیر متغیر ہے۔ یعنی باوجود تغیرّ حالات اور ترقی تمدّن اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ہے فطرت اللّٰہِ التی فطرَ الناس عَلَیْھا لا تبدیل لخلق اللہ۔ اس سے دو باتیں مستنبط ہوتی ہیں ایک یہ کہ چونکہ انسانی فطرت فطرتِ الٰہی کا عکس و پرتو ہے اس لئے اس میں لامحدودیت اور علو کی جانب ایک قوی میلان پایا جاتا ہے یعنی انسان جس چیز کی طلب و آرزو کرتا ہے۔ اس کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔... جہاں اس کا قدم آکر ٹھہر جائے ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

مال و دولت کی ہوس ہو، اقتدار و طاقت کی خواہش ہو، خدمتِ خلق کا جذبہ ہو، فضیلت علمی کا ولولہ ہو، یا فضیلت روحانی کی اُمنگ، غرضکہ کوئی بھی مادّی یا غیر مادّی نصب العین ہو اس کا نشانِ منزل اور حدِ سفر غیر متعیّن ہے۔ انسانی خواہشات اور آرزوؤں کی لامحدودیت فطرتِ بشری کو فطرت الٰہی سے ہمکنار کرتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زندگی کی ساری تعمیر و تخریب تمام ترقی و پستی۔ صلاح و فساد اور خیر و شر کی آویزش چونکہ اسی علو و فطرت اور لامحدودیت کا نتیجہ ہے اس لئے دنیا میں باہمی تصادم اور اجتماعی کشاکش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور انسانیت پر ایسا کوئی دور نہیں آئے گا۔ جب ساری نوع بشر ایک مشترکہ مرکز پر جمع ہو جائے کیونکہ اگر تمام

دُنیا کبھی ایک نصب العین، ایک مقصد، ایک تخیل یا ایک مشترکہ عقیدہ کو مان لے تو انسانی ترقی کی رفتار سُست پڑ جائے۔ بلکہ ارتقائے ہستی بالکل معدوم ہو جائے۔ حالانکہ فطرتِ انسانی جو فطرتِ الٰہی کی لامحدودیت اور علوئے غیر متناہی کا عکس و پرتو ہے، ارتقائے لامحدود اور غیر منفصل ترقی کے تقاضے سے معمور و مجبور ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بھی بیان کیا ہے:۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ -	اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو زمین پر بسنے والے تمام انسان ایمان لے آتے۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ سب ایمان لے آئیں۔
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ	اگر اللہ چاہتا تو وہ سب کو ایک ہی راہ پر جمع کر دیتا ہم نے تم میں سے ہر قوم و جماعت کے لئے ایک قانون اور طریقہ بنا دیا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ ان سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنے دائرہ رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا، کہ چونکہ انسانی اختلافات اور آویزشیں بالآخر انسانیت کی مجموعی ترقی کا باعث ہیں اس لئے دنیا میں ہمیشہ کم سے کم دو مقابل گروہ ضرور باقی رہیں گے اور ایسا کبھی نہ ہوگا، کہ ایک واحد نظامِ زندگی سارے عالم پر چھا جائے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بہتر نظامِ حیات زمین کے غالب حصہ پر نافذ اور کارفرما ہو، چنانچہ اس طرزِ خیال کی مزید تصدیق قرآن کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کا ذکر کیا گیا ہے:۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ -	پس ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا جس کا نتیجہ ہُوا کہ وہ اپنے مقامِ سکونت سے نکال دیئے گئے اور ہم نے ان سے کہا کہ زمین پر اُتر جاؤ جہاں (تمہاری اولاد) ایک دوسرے کی دشمن ہو گی۔

یعنی جب سے شیطان نے انسان کی علوئے فطرت اور لامحدودیت کا رُخ نیکی کے بجائے بدی کی جانب موڑ دیا، اس وقت سے انسان امن و عافیت کی زندگی سے محروم ہو گیا۔

جسے قرآن جنّت کے نام سے موسوم کرتا ہے نیز اسی باعث انسانیت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئی جن میں سے ہر گروہ دوسرے کا مخالف ہے۔ اگر آدم کی علوئے فطرت کا رُخ ٹھیک رہتا تو یہ باہمی آویزش، کشاکش اور بیکارانہ مسابقت معرضِ وجود میں نہ آتی اور انسانیت ایک متحدہ مرکز پر جمع رہتی لیکن اب تا قیامت انسان ایک دوسرے کے حریف اور مدّمقابل رہیں گے پھر اسی کشمکش اور تصادم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید یہ بھی فرماتا ہے :—

ولولا دفعُ اللهِ النّاس بعضهم ببعض لفسدت الارض ۔	اگر اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کو دیگر انسانوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا، تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔
ولولا دفعُ اللهِ النّاس بعضهُم ببعضٍ لهُدّمت صوامعُ وبيعٌ وصلوٰتٌ ومساجدُ يذكرُ فيها اسم الله ۔	اگر اللہ تعالیٰ بعض گروہوں کو دیگر گروہوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا، تو دیر، خانقاہ اور مساجد جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے مسمار ہو جاتیں۔

یعنی تاریخ کی وہ کشمکش جو قوموں اور گروہوں میں ہمیشہ سے جاری ہے اور جاری رہے گی اور جس کا سرچشمہ یہی علوئے فطرت اور لاتحدودیت کا انسانی میلان ہے۔ خالصتہً شر اور فساد کا باعث نہیں، بلکہ وجہ خیر بھی ہے کیونکہ اگر کسی گروہ یا قوم کو غیر متعین مدّت کے لئے زمین پر غالب رہنے دیا جائے تو نہ صرف ظلم و فساد کی پرورش ہوگی، بلکہ انسانی ضمیر و مذہب کی آزادی کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ اس طرح قرآن کی نظر میں تاریخی انقلابات اور اقوام و امم کی باہمی آویزشیں رفع فساد کا ذریعہ اور ارتقائے انسانیت کا وسیلہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے، کہ اگر انسان کی اجتماعی فطرت ایک غیر تبدیل پذیر حقیقت ہے تو اسکی بنیادی خصوصیات کیا ہیں، جن کا مظاہرہ ہر زمانہ اور ہر دور کے تاریخی واقعات میں ہوا کرتا ہے اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انقلاباتِ عالم اور واقعاتِ تاریخ حقیقتاً انسانی فطرت کی غیر متغیر خصوصیات سے صادر ہوتے ہیں۔ فطرتِ اجتماعی کی ایک خصوصیت کا ذکر تو ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی انسانی خواہشات اور حوصلوں کی لامحدودیت، دوسری خصوصیت قرآن کریم نے یہ بتائی ہے کہ خدا نے سب انسانوں کو مساوی نہیں پیدا کیا بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت اور برتری دی ہے چنانچہ جس طرح بنی آدم کو دوسری مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے اسی طرح نوعِ انسانی میں بھی مختلف

صلاحیتوں کے افراد اور مختلف صفات کی قومیں پائی جاتی ہیں ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :۔

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ؕ	اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور انہیں اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی ۔
اُنْظُرْ کَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۔	دیکھو کہ ہم نے کس طرح بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر فضیلت دی ۔
هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ	وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا اور تم میں سے بعض کو بعض پر بلند کیا تاکہ جو فضیلت تمہیں دی گئی ہے اس میں وہ تمہیں آزمائے ۔
اَللّٰهُ الَّذِیْ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۔	اللہ ہی ہے وہ جس نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے ۔
تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ	یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی

اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کی یہ خصوصیت نمایاں رہیگی کہ ان میں علم و فضل، مال و دولت، قوت و اقتدار اور دیگر صلاحیتوں کے اعتبار سے فرق ہوگا، اور اس فرق کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جو فرد یا جو قوم جس اعتبار سے دوسروں پر افضل ہے اس کا فائدہ اسے ضرور پہنچے گا، لیکن فرق مراتب اور افضلیت کی اس خصوصیت میں افراد اور اقوام کیلئے ایک آزمائش بھی ہے ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا کی ہے اس سے تمہاری آزمائش مقصود ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افراد و اقوام کو ایک دوسرے پر جو فوقیت دی گئی ہے اس سے قدرت کا منشا یہ نہ تھا، کہ ایک انسان دوسرے پر اور ایک قوم دوسری قوم پر اپنی خدائی کا سکہ جمائے اس کی محنت و مشقت یا اسکے وسائل سے اپنے لئے فوائد حاصل کرے اور پھر اس کے ساتھ ذلت اور حقارت کا برتاؤ کرے ۔ بلکہ یہ فضیلت اور برتری افراد و اقوام کو اسلئے دی گئی تھی، کہ وہ اس سے خلق خدا کو نفع پہنچائیں ۔ چنانچہ جو افراد یا قومیں اپنی فطری فضیلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کمزور افراد یا اقوام سے استحصال کرنے لگتی ہیں انکے خلاف ایک عام جذبہ نفرت پیدا ہو جاتا ہے ۔ بہرصورت اس فضیلت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں نہ تو عام افراد انسانی کے مابین

کامل مساوات رہ سکتی ہے۔ ورنہ کسی زمانہ میں جملہ اقوام عالم تمدن و معیشت اور رفتار کی ایک ہموار سطح پر آسکیں گی، بلکہ ہر زمانہ میں غالب و مغلوب اقوام رہیں گی اور ہر دور میں بعض انسان کمزور اور بعض قوی ہونگے۔ اس فطرتی فرق مراتب کا ایک فائدہ بھی ہے، اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہے کہ کم تر فضیلت رکھنے والے افراد اور قومیں اپنے سے بہتر افراد اور قوموں کی تقلید کر کے محنت و مشقت اور جد و جہد کے ذریعہ ان کی سطح تک پہنچنا چاہتی ہیں، اس طرح افراد اور قوموں میں ایک جذبہ مسابقت (Competitive spirit) پیدا ہوتا ہے جس سے انسانیت ترقی کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔ نقصان یہ ہے۔ کہ بعض افراد و اقوام اپنے سے بہتر افراد اور قوموں کی حالت پر رشک و حسد کرنے لگتی ہیں، اور اُن کے فضائل اخلاق کو اپنانے کی ایجابی (Positive) کوشش کے بجائے اس منفی (Negative) کوشش میں اپنا وقت اور اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں کہ دوسروں کو ان فوائد سے محروم کر دیں جو انکی فطری فضیلت کے باعث انہیں حاصل ہیں اسی خطرہ کو دفع کرنے کے لئے قرآن کریم فرماتا ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ — اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک دوسرے پر جو فضیلت دی ہے اس پر رشک و حسد نہ کرو۔

یعنی قدرت نے مادی وسائل، علم و فضل، حسن صورت، جسمانی طاقت یا اور کسی اعتبار سے ایک فرد کو دوسرے فرد پر اور ایک قوم کو دوسری قوم پر جو فضیلت دی ہے اس پر رشک و حسد نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ ایسے رشک و حسد کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ جو فرد یا قوم کسی مخصوص فضیلت سے عاری ہو وہ برتر افراد یا اقوام کو ان کی فضیلت کے فوائد سے محروم کر دینا چاہتی ہے جس سے باہمی فساد اور خونریزی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اس طرح قرآن حکیم نے انسان کی اجتماعی فطرت کی ایک اور بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو تاریخی واقعات اور انقلابات ملکی و قومی میں کارفرما رہتی ہے۔ یعنی دوسرے افراد اور قوموں کو ان کی فطری فضیلت اور سعی و کوشش کے فوائد سے محروم کر دینے کی کوشش لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس قسم کی منفی کوششیں بالعموم اسی وقت عمل میں آتی ہیں جب برتر افراد و اقوام اپنی فضیلت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگتی ہیں اور انسانیت کی خدمت کرنے کے بجائے کمزوروں پر اپنی برتری کا سکہ جمانا چاہتی ہیں، چنانچہ آجکل

سرمایہ داروں کے خلاف جو عام جذبۂ نفرت پیدا ہو گیا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارا
متموّل اور دولتمند طبقہ اپنی مالی فضیلت کا غلط استعمال کر رہا ہے ۔ اسی طرح امریکہ کے
خلاف ایشیا اور دنیا کے دوسرے حصّوں میں جو نفرت بڑھ رہی ہے اس کا سبب بھی یہی ہے۔
اگر امریکہ اپنی دولت و ثروت کے ذریعہ انسانیت کی کوئی مفید خدمت انجام دیتا تو کوئی قوم اس سے
بغض و عناد نہ رکھتی لیکن چونکہ اس فضیلت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر وہ اقوام عالم پر اپنی معاشی اجارہ داری
اور سیاسی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے اور ایشیائی ممالک کو جو معاشی امداد دیتا ہے اس کی غرض
یہ ہوتی ہے کہ ان ملکوں کی حکومتیں سرمایہ داروں کے سیاسی مفاد کی حفاظت کریں اور امریکہ کی دست نگر
اور محکوم رہیں؛ اس لئے دوسری قوموں کو بجا طور سے امریکہ اور اس کے ساتھیوں سے نفرت پیدا
ہو گئی ہے۔ یہی بات ایک قوم کے مختلف افراد پر بھی صادق آتی ہے ۔ اگر ہمارے سیاسی لیڈر،
ہمارے عہدہ دارانِ نظم و نسق۔ ہمارے متموّل اشخاص، ہمارے اہلِ قلم اور صحافی اپنی مخصوص فضیلتوں
کو قوم کی خدمت کے کام میں لگائیں، تو قوم انکی دل سے عزّت کریگی لیکن چونکہ اس فضیلت سے
ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ دوسرے کمزور انسانوں پر اپنا تفوّق قائم کرنا چاہتے ہیں، انکے مقابلہ میں متکبّرانہ
طرزِ عمل اختیار کر کے انکے ساتھ تذلیل و تحقیر سے پیش آتے ہیں؛ اس لئے انکے خلاف قوم کے
مظلوم افراد میں ایک جذبہ عناد پیدا ہو رہا ہے ۔ قرآن کا نظریۂ فضیلت ہمیں سکھاتا ہے کہ افراد
و اقوام کا ایک دوسرے پر تفوق استحصال اور ظلم کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس لئے تاکہ برتر اور فائق
افراد کمتر اور کمزور افراد کی خدمت کریں اور انکی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح طاقتور
اور غالب اقوام کو انکی فضیلت کے باعث جو اقتدار و تسلّط حاصل ہوتا ہے اس سے بھی قدرت
کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے پسماندہ حصّوں کو ابھاریں، اور غیر ترقّی یافتہ قوموں کو اپنی
سطح پر لانے کی کوشش کریں۔ جب افراد اور اقوام اپنے اس مشن سے غافل ہو کر اپنی مادّی، تہذیبی یا
علمی فضیلت کا غلط استعمال کرتے ہیں، اور کمزور افراد و اقوام پر دستِ تعدّی دراز کرتے ہیں، تو
ان کے خلاف ایک عام جذبۂ نفرت پیدا ہو جاتا ہے ۔ جو کبھی فوجی بغاوتوں کی صورت میں نمودار
ہوتا ہے کبھی سیاسی سازشوں کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ اور کبھی کمیونزم کے لباس میں منظرِ عام پر آتا ہے۔
اس کے بعد قرآن فطرت اجتماعی کی ایک اور خصوصیّت کا تذکرہ کرتا ہے جو تہذیبی انقلابات

کی تاریخ میں بہت نمایاں ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :—

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ۔ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ۔

لوگوں کے لئے زینت رکھی گئی ہے عورتوں، لڑکوں اور چاندی سونے کے اکٹھے کئے ہوئے ڈھیروں، نشان کئے ہوئے گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتیوں کی محبت میں یہ تو دنیوی زندگی کی متاع ہے! اور اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے کہو کیا میں اس سے بہتر مقصد زندگی کی طرف تمہیں متوجہ کروں ان لوگوں کا مقصد جو اللہ کے قانون مکافات عمل سے ڈرتے ہیں اور جنکے لئے انکے رب کے پاس باغ ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہینگے پاک صاف بیویوں کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور خوشنودی سے سرفراز ہو کر اور اللہ اپنے بندوں (کے اعمال) کی پوری پوری خبر رکھنے والا ہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ، صبر کرنیوالے اپنے قول کو سچ کر دکھانیوالے فرمانبرداری کرنیوالے، اپنے مقصد کیلئے مال و دولت خرچ کرنیوالے اور پچھلی راتوں میں خدا سے استغفار کرنے والے۔

اس آیت میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دنیا کے بیشتر افراد و اقوام مادی وسائل حیات اور زندگی کی ظاہری زینتوں کو اپنا مقصد زندگی قرار دیکر ان کے حصول کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں یعنی انسان پر تملیکی (Acquisitive Instincts) جبلتوں کا اثر زیادہ وسیع اور قوی ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کی اکثر بیشتر لڑائیاں اور انقلابات میں انسان کی یہ اجتماعی خصوصیت پورے طور سے کارفرما رہتی ہے۔ اگرچہ ہر زمانہ میں مقابل گروہ اور برسرپیکار طبقات اپنے مقاصد کو اخلاق و مذہب اور اعلیٰ روحانی اقدار کا رنگ دینا چاہتے ہیں۔ اور نہایت خوشنما الفاظ

واصطلاحات میں ان کی توضیح کرتے ہیں لیکن اگر ان گروہوں اور طبقوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انکی جدّوجہد اور آویزش دنیوی مال ومتاع، اسباب وزینت وآرائش اور سامانِ عیش کے حصول کیلئے ہوتی ہے۔ اسکے بالمقابل قرآن ایک اور مقصد بھی پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ایک بہتر نصب العین کی جدّوجہد بھی کر سکتے ہو۔ اور وہ یہ کہ تملیکی مقاصد (Acquisitive Ideals) کے بجائے تخلیقی مقاصد (Creative Ideals) کے لئے کشمکش کرو۔ پھر وہ اس مختصر جماعت اور قلیل التعداد گروہ کی صفات وخصوصیات بیان کرتا ہے جو زندگی کے اعلیٰ اقدار اور تخلیقی مقاصد کے لئے سرفروشی کرتا ہے اور دوسروں سے کچھ لینے کے بجائے انہیں اپنے پاس سے کچھ دینے کا متمنّی رہتا ہے۔ تاریخ کے انقلابی دور میں ایسی ہم مختصر تخلیقی جماعتیں اور ایسے ہی کم تعداد مجاہدین جو مال ودولت حاصل اور جمع کرنے کے بجائے اپنی تھوڑی بہت پونجی بھی اعلیٰ تر مقاصد کیلئے کھو بیٹھتے ہیں، ظالموں، استحصال کنندوں اور تملیکی مقاصد رکھنے والے کثیر التعداد گروہوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ اس جماعت کی صفات میں سب سے پہلی صفت تقویٰ کی ہوتی ہے یعنی اس کے ارکان قانونِ مکافاتِ عمل کے نتائج سے ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جبلتاً محسوس کر لیتے ہیں کہ ظلم واستحصال، تکبّر اور کمزوروں کے حقوق کی پامالی غرضکہ ساری اجتماعی بداعمالیاں اپنے نتائج پیدا کرکے رہتی ہیں اور غیر محسوس طور پر اس گروہ کی بربادی کے اسباب جمع کرتی ہیں جو ان کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ قلیل التعداد جماعتیں ظلم وتعدّی استکبار اور کمزوروں کے ساتھ ناانصافی کرنے سے بچتی رہتی ہیں اور عدل وخیر کے تخلیقی تقاضے پورے کرتی ہیں۔ پھر دوسری صفت اس گروہ کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نصب العین کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف اور مصائب کو نہایت صبر واستقامت سے برداشت کرتا ہے تیسری صفت اس جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے اسے سچ کر دکھاتی ہے اسکے برخلاف تملیکی مقاصد رکھنے والے گروہ اعلانات تو بڑے خوشنما کرتے ہیں انکے نعرے بھی بڑے اُمید افزا اور خوش آیند ہوتے ہیں لیکن جب ان اعلانات، نعروں اور وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آتا ہے۔ تو یہ لوگ بُری طرح ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ ان میں صدق کی صفت معدوم ہوتی ہے۔ پھر قرآن ان گروہوں اور جماعتوں کی جو تخلیقی مقاصد

کی جدوجہد کرتے ہیں، ایک اور خصوصیت[1] بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ اپنی معاشی تنگ حالی اور بے زری کے باوجود یہ لوگ اپنے مقصد کے لئے نہایت فیاضی اور دریا دلی سے روپیہ خرچ کرتے ہیں، ان میں انفاق یعنی اعلیٰ مقاصد کے لئے مالی قربانیاں کرنے کا بے پناہ جذبہ ہوتا ہے ان کی مقابل جماعت یعنی تملیکی جذبات رکھنے والے گروہ دنیوی دولت اور مادی وسائل کے اعتبار سے تو بہت آگے ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اسبابِ زینت اور سامانِ عیش پر جان دیتے ہیں اور اپنے اعلیٰ معیارِ زندگی کی بدولت اجتماعی مقاصد کے لئے روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے مجبور ہوتے ہیں، اس لئے ان میں اپنے مقصد کے لئے مالی قربانیاں کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ جو ایک صالح، ترقی پذیر، مگر دُنیوی حیثیت سے کم مایہ جماعت کے ارکان میں ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن دُنیا کی ساری خرابیوں اور تاریخ کی تمام خونریزیوں کی ذمہ داری انسان کی تملیکی ذہنیت (Acquisitive mentality) کے سر رکھتا ہے جو اُسے شہوت رانی، لذّت طلبی، عیش پرستی، حصولِ دولت اور زینت و تفاخر کے اسباب جمع کرنے میں مشغول رکھتی ہے اور اس میں سے یہ حوصلہ فنا کر دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی بھلائی اور ترقی کے لئے بھی اپنے وقت، مال اور اپنی توانائیوں کا کچھ حصّہ صرف کرے قرآن کہتا ہے کہ یہ طرزِ زندگی جس میں جذبہ خدمت اور جذبۂ تخلیق کے بجائے جذبۂ تفاخر اور جذبۂ نمائش غالب ہو، بالآخر قوموں اور گروہوں کو بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے

---

[1] یہ ضروری نہیں ہے، کہ اس قسم کی انقلابی اور اصلاحی جماعتوں یعنی تخلیقی گروہوں میں وہ تمام صفات موجود ہوں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے، کہ تاریخ کے تمام تخلیقی اور انقلابی گروہوں میں قرآن کی بیان کردہ اکثر و بیشتر صفات پائی جاتی ہیں مثلاً انقلاب فرانس کے داعیوں . . . . . (French Revolutionaries) میں صدق، صبر اور انفاق کی صفات تو پائی جاتی تھیں لیکن استغفار، توبہ اور دیگر صفاتِ ایمانی ناپید تھیں۔ اسی طرح روسی بالشویکوں . . . (Bolsheviks) میں بھی آخر الذکر صفات موجود نہ تھیں لیکن وہ اپنے مقصد کے سچے تھے اس کیلئے مالی ایثار اور جانی قربانی سے دریغ نہ کرتے تھے اور اپنے وعدوں اور اعلانات کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی جماعت میں قرآن کی بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں

بہتر طریقِ زندگی وہ ہے جس میں آدمی ادنیٰ مادی مقاصد یعنی متاعِ دنیوی کے حصول کی جدوجہد میں عمر نہ ضائع کرے۔ بلکہ اعلیٰ روحانی اور تخلیقی مقاصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ قوم کا خزانہ خالی کرنے کے بجائے اس میں اپنی طرف سے کچھ ملائے۔ اور اپنے بھائیوں کو گرا کر آگے بڑھنے کے بجائے انہیں بلند کرنے کی اُمنگ سے سرشار ہو۔ بالفاظِ دیگر اکتسابِ مال و دولت اور حصولِ اقتدار کی خواہش کے بجائے خدمت اور تخلیق کے جذبہ سے معمور ہو۔

قوانینِ تاریخ کا قرآنی نظریہ

انسان کی اجتماعی فطرت کی ان بنیادی خصوصیات سے قرآن چند قوانینِ تاریخ اخذ کرتا ہے جنھیں وہ سنن الٰہی سے موسوم کرتا ہے۔ اور پھر گذری ہوئی قوموں کی زندگی پر ان قوانین یا سننِ تاریخ کا اطلاق کر کے وہ اپنی ہمعصر قوموں اور بالخصوص اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطب خاص ہیں، متنبہ کرتا ہے کہ اگر انھوں نے اس طریقِ فکر اور طرزِ زندگی کو ترک نہ کیا جن سے پہلی قومیں برباد ہو چکی ہیں۔ تو انھیں یاد رکھنا چاہیئے، کہ قوانینِ تاریخ کا عمل ہر قوم کے لئے یکساں ہوتا ہے اور ان کے اعمال کا انجام بھی وہی ہوگا جس کا دوسری قوموں کو تجربہ ہو چکا ہے یعنی قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے ان کا شیرازۂ حیات درہم برہم ہو جائیگا۔ اور وہ اجتماعی حیثیت سے ذلیل، پست اور فنا پذیر ہو جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ کے انھیں غیر متغیر قوانین کا ذکر کرتے ہوئے جن کے عمل سے ہر زمانہ میں تعمیری اور تخریبی انقلابات واقع ہوتے ہیں، قرآن کہتا ہے :-

قُل لِلَّذِینَ کفروا ان ینتھوا یُغفر لکم ما قد سلف وان یعودوا فقد مضت سنت الاوّلین -

جن لوگوں نے کفر کیا ہے اُن سے کہدو کہ اگر تم اپنے اعمال کو ترک کردو، تو جو کچھ پہلے کر چکے ہو سب معاف کر دیا جائیگا لیکن اگر تم کفر پہ اڑے رہے تو تم سے پہلوں کی سنت گذر چکی ہے

وما منع الناس اذ جاءھم الھدیٰ و یستغفروا ربھم الّا ان تاتیھم سنۃ الاوّلین -

جب ہدایت آگئی تو اب پھر لوگوں کو کس چیز نے روکا تھا، کہ وہ اپنے رب سے استغفار کرنے بجز اس کے کہ ان کے ساتھ اگلوں کا طریقہ برتا جائے -

ولقد ارسلنا من قبلک فی شیع الاولین - وما یاتیھم من رسولٍ الّا کانو بہ یستھزءون - کذالک نسلکہ

اور تجھ سے پہلے بھی لوگوں کے گروہوں میں رسول بھیجے گئے اور ایسا کوئی رسول انکے پاس نہیں آیا جس کا انھوں نے مذاق نہ اڑایا ہو، اسی طرح ہم اُسے مجرموں کے قلوب میں ڈال

فی قلوب المجرمین، لا یؤمنون بہ و قد خلت سنۃ الاولین -

وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا واذا لا یلبثون خلفک الا قلیلا - سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا -

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم کانوا اشد قوۃ وآثارا فی الارض فما اغنی عنھم ما کانوا یکسبون - فلما جاءتھم رسلھم بالبینٰت فرحوا بما عندھم من العلم وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون - فلما راوا باسنا، قالوا آمنا باللہ وحدہ وکفرنا بما کنا بہ مشرکین - فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا - سنت اللہ التی قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکافرون -

کر دیتے ہیں اور وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اور پہلوں کا طریقہ بھی یہی رہا ہے -

اور اُنہوں نے ارادہ کیا تھا کہ تجھے اس سرزمین میں خفیف بنا دینگے - تاکہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس صورت میں یہ بھی تیرے پیچھے نہ رہیں گے، یہی طریقہ ان پیغمبروں کے ساتھ بھی برتا گیا جو تجھ سے پہلے بھیجے گئے تھے اور ہماری سنت میں کبھی تبدیلی نہ ہو گی -

کیا تم نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی جو دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جو پہلے گزر چکے ہیں اور جنکی قوتیں اور نشانیاں تم سے زیادہ تھیں، تو ان چیزوں نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا، جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب انکے رسول کھلی ہوئی نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو وہ اسی علم پر خوش ہو گئے جو پہلے ان کے پاس موجود تھا اور ان کو سزا نے آ لیا جس پر وہ استہزا کرتے تھے - تو جب اُنھوں نے ہمارا عذاب دیکھا اور ایمان لانے پر آمادہ ہوئے تو ان کے ایمان نے انہیں کوئی نفع نہیں پہنچایا، یہی اللہ کی وہ سنت ہے جو اسکے بندوں کی زندگی میں جاری رہتی ہے۔ اور کافروں کو بالآخر نقصان اُٹھانا پڑیگا -

ان آیات میں قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا ہے کہ تمہارے ساتھ اور تمہاری اصلاحی جماعت کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اور جن تلخ اور ناخوشگوار تجربات سے تمہیں گزرنا پڑ رہا ہے ان پر تعجب یا افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے - یہ محض اتفاقی حوادث نہیں - بلکہ یہ سارے واقعات ایک مستقل قانون کے ماتحت ظاہر ہو رہے ہیں، اسی قسم کے واقعات پہلے زمانہ

میں اصلاحی جماعتوں کو پیش آچکے ہیں اور آئندہ بھی جو جماعت کسی اصلاحی انقلاب کے لئے کھڑی ہوگی، اسکو بھی یہی واقعات پیش آئینگے۔ کیونکہ سنن الٰہی یا قوانینِ تاریخ کا عمل اسی طرح ہوتا رہا ہے، اور آئندہ بھی ہوگا۔ انسان کی اجتماعی فطرت کی جو خصوصیات ہم نے بیان کی ہیں، ان کا لازمی اقتضاء بھی یہی ہے کہ اس قسم کے واقعات پیش آئیں۔

اس طرح قرآن نے سب سے پہلے تاریخ میں مستقل قوانین (سنن الٰہی) کا اثبات کیا اور اس خیال کی تردید کی کہ تاریخ کے واقعات محض بخت و اتفاق یا کسی اندھی بہری مشیت کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ قرآن عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ دونوں کو مستقل قوانین کا تابع قرار دیتا ہے جس چیز کو ہم مشیتِ الٰہی قرار دیتے ہیں وہ درحقیقت قوانین فطرت اور قوانینِ تاریخ کا عمل ہے کیونکہ مشیتِ الٰہی انہیں واقعات و تغیرات کے ذریعہ اپنا اظہار کرتی ہے جو عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ میں رونما ہوتے ہیں۔ جو قومیں ان واقعات کو محض اللہ کی وقتی رضامندی اور غیض و غضب یا تاریخی حوادث پر محمول کرتی ہیں وہ مشیتِ الٰہی کے فہم سے ہمیشہ عاری رہتی ہیں، اور ایسی قوموں کو اپنی کم فہمی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے، کامیابی انہیں اقوام اور جماعتوں کے حصہ میں آتی ہے جو تاریخ اور فطرت کے واقعات و تغیرات کے مشاہدہ سے ان مستقل قوانین تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں جنکی بنا پر یہ انقلابات سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ جو یہاں اندھے ہیں وہ آخرت میں بھی اندھے رہینگے۔ ومن کان فی ھٰذہٖ اعمٰی فھو فی الآخرۃ اعمٰی اسی حقیقت کا اظہار و اثبات ہے۔ بہ ظاہر ہے کہ فطرت کے واقعات سے وہی قوم اور جماعت سبق لے سکتی ہے جو تاریخ و فطرت کے مستقل قوانین کا علم رکھتی ہو۔ یعنی جو واقعاتِ عالم پر انکی انفرادی حیثیت میں غور نہ کرے، بلکہ یہ معلوم کرے کہ یہ واقعات کس مستقل قانون کے ماتحت پیش آرہے ہیں۔ جو قوم واقعاتِ تاریخ اور حوادثِ فطرت کے قوانین معلوم کر لیتی ہے، وہ اپنی اجتماعی اور ثقافتی زندگی میں ضروری اصلاحات بآسانی عمل میں لا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف جس جماعت کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ اسے جن تجربات و واقعات سے سابقہ پڑ رہا ہے انکی اصلی علت کیا ہے، جو انقلاباتِ زمانہ اور تغیراتِ فطرت کو محض اتفاقی حوادث یا کسی نامعلوم مشیت کا نتیجہ سمجھتی ہو اور ان قوانین کے علم سے بے بہرہ ہو، جن کے مطابق واقعاتِ عالم صورت پذیر ہوتے ہیں، وہ ابدالآباد تک اپنی اصلاح سے عاجز

رہتی ہے۔ اور اس کے لئے معاشرت کی رسوم، تمدن کے اوضاع و اطوار یا مذہب کے ذیلی اور فروعی عقائد میں اقتضائے حالات کے مطابق تبدیلی پیدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی معاشرت اس کا تمدن اور اس کے عقائد مذہبی طرح طرح کی خرابیوں اور نقائص سے لبریز ہونگے، اور اس احساس کے باوجود کہ اس کے اندر کوئی خرابی موجود ہے ان نقائص کے سبب حقیقی سے ناواقف رہیگی۔ کیونکہ وُہ قوانینِ فطرت اور قوانینِ تاریخ یعنی سننِ الٰہی کی طرف سے اندھی بہری ہے۔ پھر جو قوم ایسی خرابیوں اور ایسے مفاسد کا شکار ہو، اس کی آخرت بھی یقیناً خراب ہوگی۔ خواہ ہم آخرت سے اس کا دنیوی انجام مراد لیں یا حیات بعد الممات، جو قومیں ظلم و استبداد، معاشی ناانصافیوں، جہالت، عیش و عشرت اور اسی قسم کی دوسری برائیوں میں مبتلا رہتی ہیں، ان کے افراد نیک کردار نہیں ہو سکتے۔ اس لئے لازماً ان افراد کی حیاتِ اخروی بھی فلاح و سعادت سے خالی ہوگی۔ لہٰذا قرآن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جو جماعت یہاں اندھی ہے وُہ وہاں بھی اندھی رہیگی، یعنی جس گروہ کو قوانینِ فطرت اور قوانینِ تاریخ میں درک و بصیرت نہ ہو، اس کا انجام اس عالم میں بھی اچھا نہ ہوگا، اور عالمِ آخرت میں بھی اس کی نجات کا کوئی امکان نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک غلط خیال ہمارے ذہنوں میں یہ پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن اقوام سابقہ کی تباہی اور بربادی کے سلسلہ میں جن قوانینِ تاریخ یا سننِ الٰہی کا ذکر کرتا ہے، وُہ انہیں قوموں کے تاریخی انجام کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں جن کا اس نے بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔ اور قرآن کی ہمعصر تاریخ یا زمانہ مابعد کی تاریخ میں جو واقعات و انقلابات پیش آئے ان پر قرآن کے بتلائے ہوئے قوانینِ تاریخ یا سننِ الٰہی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ——— اس کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ اقوام کی بربادی جن حالات کے تحت عمل میں آئی، وُہ موجودہ واقعات و انقلابات کی علتوں سے مختلف ہیں، قرآن کے بیان کردہ سننِ الٰہی سے قدیم اقوام کے زوال و بربادی کی توجیہہ تو ہو سکتی ہے لیکن خود مسلمانوں کی تاریخ میں جو واقعات و انقلابات پیش آئے، اور موجودہ قوموں کی تاریخ میں جو ناٹک رچا جا رہا ہے۔ وُہ ان قوانین کے عمل سے مستثنیٰ ہیں جنھیں قرآن سننِ الٰہی سے موسوم کرتا ہے۔ اور جن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے، کہ وُہ غیر متبدل اور مستقل قوانینِ حیات ہیں، اس نقطۂ نظر سے لازمی طور پر یہ نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے، کہ موجودہ زمانہ کے قوانینِ

تاریخ کچھ اور ہیں۔ اور گذشتہ قوموں کا انحطاط و زوال کسی اور قانون کے بموجب عمل میں آیا تھا۔ اگر تاریخ کے متعلق یہ زاویہ نگاہ اختیار کیا جائے، تو اس میں کوئی تسلسل باقی نہیں رہتا اور قرآن موجودہ تاریخ کی توجیہہ کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ بیکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے گذشتہ اقوام کی بربادی کے سلسلے میں جن قوانین تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے اُن میں ایسی کوئی تخصیص نہیں پائی جاتی - جس سے ان کی صداقت کسی خاص دور کے لئے صحیح تسلیم کی جائے اور زمانہ مابعد کی تاریخ کے لئے انھیں بے فائدہ تصور کیا جائے۔ قرآن کے انداز بیان میں عمومیت ہے سنن الٰہی کا اثبات وہ صرف مشرکین مکہ کے مقابلہ میں نہیں کرتا ہے یعنی یہ نہیں کہتا ہے، کہ چونکہ مشرکین مکہ ان برباد شدہ قوموں کے قدم بقدم چل رہے ہیں، اس لئے وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ یہ وعید صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے لئے نہیں، بلکہ ہر اس قوم کے لئے ہے۔ خواہ وہ کسی دور کی ہو جو ایک غلط طرز زندگی اور غلط طرز فکر کے ماتحت انجام سے بےخبر ہو کر زندگی گزارے۔ لھٰذا قرآن جن سنن الٰھی کا اثبات کرتا ہے ان میں ایک دائمی صداقت ہے اور ان کا اطلاق موجودہ زمانہ کے انقلابات و حوادث پر بھی اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح عاد و ثمود کے واقعات پر، چنانچہ اسی کتاب میں آئندہ چل کر ہم موجودہ زمانہ کی تاریخ سے بحث کر کے قرآن کی بیان کردہ سنتوں یا قوانین تاریخ کا اطلاق، یورپ کی جدید اقوام اور قرآن کی ہمعصر رومی قوم پر کریںگے جس سے معلوم ہوگا کہ قرآن جس قانون کو سنت الٰھی سے تعبیر کرتا ہے، وہ تاریخ جدید میں بھی اسی طرح کارفرما اور عمل پیرا ہے، جس طرح گذشتہ تاریخ میں علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے۔ کہ خود مسلمان قوم جس عذاب غلامی اور ذلت میں مبتلا ہوئی، وہ بھی انہیں سنن الٰہی کے عمل کا نتیجہ تھا، جن کی گرفت سے عاد و ثمود اہل مدین اور اصحاب ایکہ تباہ و برباد ہوئے۔

افسوس اس بات کا ہے، کہ مسلمانوں کے اس غلط تاریخی نقطہ نظر سے قرآن کریم کی افادیت کو شدید نقصان پہنچا۔ اور اسے ایک مجموعہ احکام و ضوابط یا مجموعہ روایات و قصص تصور کیا جانے لگا۔ حالانکہ قرآن جس طرح معاشرتی اور تمدنی زندگی کے دائرہ میں ہماری ہدایت و رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح موجودہ واقعات تاریخ اور انقلاب اقوام کی توجیہہ و تشریح کا بھی ایک مخصوص طریقہ بتایا ہے۔ البتہ چونکہ قرآن کو انسان کے جزوی تمدنی مسائل سے بحث

نہیں ۔ بلکہ اس کی توجہ تمامتر اجتماعِ انسانی کے کلی اصولوں پر مرکوز رہتی ہے۔ اس لئے
وُہ تاریخ کے جزویات سے بحث نہیں کرتا ہے۔ بلکہ تاریخی واقعات و انقلابات کے
بنیادی اسباب اور عمومی کلیات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اور ایک جامع فلسفۂ
تاریخ پیش کرکے ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ ہم اپنی ہمعصر زندگی اور اپنے قومی مستقبل پر ارتقی
اور پیش قیاسی کرنے نیز گردوپیش کی اقوام کے حالات کو سمجھنے میں اس کے فلسفۂ تاریخ
و تمدّن سے مدد لیتے رہیں ؞

آیاتِ تاریخ اور آیاتِ فطرت

سنن الٰہی کی اصطلاح کے علاوہ جسے قرآن کریم نے قوانینِ تاریخ کے لئے استعمال کیا ہے وُہ واقعاتِ تاریخ سے استنباط نتائج کے لئے ایک اور اصطلاح یعنی آیت یا آیات کا کثرت سے استعمال کرتا ہے، یہ لفظ قرآن نے تین مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے کہیں تو وُہ لفظ آیت کو الہامی کتابوں کی عبارت کے لئے استعمال کرتا ہے بعض جگہ یہ لفظ مشاہدہ فطرت کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے۔ اور ان معنوں میں قرآن نے قوانینِ قدرت کے افعال و اثرات کو آیاتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے اس کے علاوہ چند مقامات پر وُہ اس لفظ سے واقعاتِ تاریخ کے فہم کی ضرورت کا اثبات کرتا ہے۔ اور ان قوانین کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ جو انقلاباتِ تاریخ کی تہ میں کارفرما ہیں اس طرح قرآن میں لفظ آیت اپنے عام مفہوم کے علاوہ اس خاص مفہوم میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کے نزدیک ہدایت کے تین بڑے سرچشمے ہیں یعنی اوّلاً آیاتِ الٰہی جو پیغمبروں پر نازل ہوئیں۔ دُوسرے آیاتِ فطرت جس طرح وُہ عالم طبعی اور عالم فطرت میں ظاہر ہوتی ہیں اور تیسرے آیاتِ تاریخ جن کا مشاہدہ واقعاتِ تاریخ میں ہوتا ہے۔ یہ تین[ف۱] ذرائع

ف۱ یورپ کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے عروج و ارتقاء کا بنیادی سبب بھی ہوا کہ اس نے آیاتِ فطرت پر غور کرنا سیکھا اور مشاہدہ فطرت سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ عالم طبعی پر ایک تا در قانون کی فرمانروائی ہے۔ اس طرح یورپ نے عقیدہ توحید کے ایک اہم جزو کو اپنا کر مشرکانہ رسوم، روایت پرستی، توہم زدگی اور بے معنی ظواہر و شعائر سے اپنا دامن چھڑا لیا پھر قوانینِ فطرت کا استنباط کر کے اس نے ان کا اطلاق عملی زندگی پر کرنا شروع کیا اور اس کوشش کے سلسلے میں ایسے ایسے نادر حقائق دریافت کئے جنہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نئی نئی ایجادات و انکشافات کا دروازہ کھول دیا نیز انسان کی حیاتیاتی (Biological) اور تمدنی زندگی کے بارے میں نہایت بیش قیمت معلومات فراہم کئے لیکن سرمایہ داروں نے آیاتِ تاریخ سے غفلت برتی اور جن عوامل (Factors) سے قومیں تباہ و برباد

(باقی بر صفحہ ۳۴)

ہدایت یعنی انبیاء کی آسمانی کتب صحیفۂ فطرت اور اوراقِ تاریخ انسان کی مدنی اور اجتماعی ترقی کے لئے ضروری ہیں، مسلمانوں نے اپنی الہامی کتاب کو بجا طور سے ہدایت کا سرچشمہ خیال کیا لیکن فطرت اور تاریخ کی راہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کی جو ہدایت و رہنمائی کرتا ہے، اس سے غافل رہے۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ وہ اقوام مسلمانوں سے آگے بڑھ گئیں، جن کے پاس الہامی کتاب تو نہ تھی لیکن جنھوں نے آیاتِ فطرت اور آیاتِ تاریخ کے فہم و مشاہدہ کی صلاحیت پیدا کر لی۔ قرآن کے نزدیک یہ تینوں اقسامِ ہدایت ضروری ہیں۔ چنانچہ جب وہ کہتا ہے کہ کتنی ہی آیات ہیں، جو زمین و آسمان میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں، مگر لوگ ان پر عالمِ غفلت میں گزر جاتے ہیں۔ (وکاین من اٰیۃٍ فی السمٰوٰت والارض یمرون علیھا وھم عنھا معرضون) اور جن حقائق کی وہ خبر دیتی ہیں۔ ان سے نابلد رہتے ہیں، تو قرآن کے اس بیان سے یہ ظاہر ہے، کہ وہ الہامی کتابوں میں درج کی ہوئی آیات کا ذکر نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ ان آیات کا جو فطرت اور تاریخ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح حسب ذیل آیات میں بھی قرآن فطرت اور تاریخ کے واقعات کی طرف توجہ دلانے کے لئے اس لفظ کا استعمال کرتا ہے:-

وآیۃٌ لھم الارض المیتۃُ احییناھا و اخرجنا منہ حبًّا فمنہ یاکلون۔	اور انکے لئے ایک آیت (فطرت) ہے مردہ زمین کہ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس میں سے اناج نکالا تو وہ اس سے کھاتے ہیں۔
وآیۃٌ لھم انّا حملنا ذریّتھم فی الفلکِ المشحون۔	اور ایک آیت (فطرت) ہے انکے لئے یہ کہ ہم انکی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں اٹھاتے ہیں۔

(صفحہ ۳۳ کا بقیہ نوٹ) ہوتی ہیں۔ ان پر انگریز یا امریکن ملوکیت پرستوں کی نگاہ نہیں پڑی۔ جس کا نتیجہ اب چین، کوریا اور ایران وغیرہ میں ظاہر ہو رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ تہذیب کے برعکس اشتراکی تہذیب نے آیاتِ تاریخ پر غور کر کے واقعاتِ تاریخ کی توجیہہ و تعبیر کا ایک ایسا طریقہ دریافت کیا جس میں صداقت کا کافی عنصر موجود ہے۔ اور جو قرآن کے نظریۂ تاریخ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے تاریخ کو ایک واحد قانون یعنی مادی اور معاشی عوامل کا نتیجہ قرار دیکر عقیدۂ توحید کے ایک ادنیٰ حصے کو اڑا لیا لیکن یہ دونوں تہذیبیں، توحید کے دو مختلف اجزا پر مبنی ہیں۔ پوری توحید قرآن ہی سے مل سکتی ہے۔ اور آخری کامیابی اسی تہذیب کو حاصل ہوگی۔ جو قرآن کے توحیدی نظریۂ حیات پر کامل طور سے مبنی ہو۔

وآیۃٌ لھم الیلُ نسلخُ منہُ النھارَ۔

اور ایک آیت (فطرت) ہے انکے لئے رات جس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

وجعلنا الیل والنھار آیتین فمحونا آیۃَ الیل وجعلنا آیۃَ النھار مبصرۃً لتبتغوا فضلاً من ربکم۔

اور ہم نے رات اور دن کو دو آیات (فطرت) قرار دیا پھر رات کی آیت (فطرت) کو مٹا دیا اور دن کی آیت (فطرت) کو روشن بنا دیا، تاکہ تم اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرو۔

لقد کان فی یوسف واخوتہ آیٰتٌ للسائلین۔

یوسف اور اس کے بھائیوں کے واقعہ میں جستجو کرنیوالوں کیلئے آیات (تاریخ) ہیں

امحسبت ان اصحٰب الکھف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبًا۔

کیا تم نے یہ سمجھا ہے کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری کوئی حیرت انگیز آیات (تاریخ) ہیں۔

واذ رأک الذین کفروا ان یتخذونک الا ھزوًا اھذا الذی یذکر الھتکم وھم بذکر الرحمٰن ھم کافرون خُلق الانسان من عجل۔ ساوریکم آیاتی فلا تستعجلون۔

اور جب کافر تجھے دیکھتے ہیں تو وہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں کہتے ہیں کیا یہی وہ ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے اور وہ خود رحمٰن کے ذکر سے انکار کرتے ہیں انسان کو فطرتاً جلد باز پیدا کیا گیا ہے میں تمہیں اپنی آیات (تاریخ) دکھاؤنگا۔ جلدی نہ کرو۔

مولانا محمد علی اپنی تفسیر قرآن میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عذاب جس کے متعلق وہ (کافر) سوال کرتے ہیں اسی دُنیا کا عذاب ہے کیونکہ اس چیز کا آلینا جس کی وہ ہنسی کرتے ہیں، درحقیقت اُن کی اپنی ہلاکت ہے نہ کچھ اور۔ درحقیقت یہ ساوریکم آیاتی فلا تستعجلون سے صاف ظاہر ہے کیونکہ وہ جس نشان کو جلدی مانگتے ہیں وہ نشان ہلاکت ہے نہ قیامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے ہی نشان دکھانے کا وعدہ ہے۔ قیامت نشان نہیں کہلائی جاسکتی ہے"

غرضکہ مندرجہ بالا آیات اور بالخصوص آخری آیت کی تفسیر سے جو ایک مشہور مفسرِ قرآن کا نتیجہ فکر ہے یہ ظاہر ہے کہ قرآن آیت کا لفظ ایسے واقعاتِ فطرت اور واقعاتِ تاریخ دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے جن سے سنن الٰہی یا تاریخ اور فطرت کے مستقل قوانین پر

روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جب وُہ کفّار کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ کہ جلد ہی تُم کو خُدا اپنی آیت (یعنی تمھاری ہلاکت) دکھائیگا تو اس سے ظاہر ہے کہ لفظ آیت ایسے واقعات تاریخ کیلئے استعمال ہوا ہے۔ خواہ وُہ پیش آ چکے ہوں یا پیش آنے والے ہوں، جن سے انسان اپنے طرزِ فکر اور طریقِ حیات کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلّق کوئی نتیجہ مستنبط کر سکے۔ درحقیقت قرآن آیاتِ فطرت اور آیاتِ تاریخ کی طرف بار بار اشارہ کر کے گمراہ قوموں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ فطرت اور تاریخ کے واقعات میں جو تسلسل، یکسانیت اور باہمی ربط ہمیں نظر آتا ہے وُہ اِس امر کی قوی دلیل ہے کہ یہ واقعات کسی بنیادی قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں، جو تبدیلی اور تغیّر سے مبّرا ہے۔ انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے، کہ مظاہرِ فطرت یا واقعاتِ تاریخ کسی اتفاقی حادثہ یا نامعلوم مشیّت کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ اگر وُہ غور کرے تو معلوم ہوگا کہ تاریخ اور فطرت دونوں ایک ہی قانون کے زیرِ فرمان اور محکوم و تابع ہیں۔ اگر اِس قانون کو انسان دریافت کرے جو حوادثِ فطرت اور انقلاباتِ تاریخ میں کارفرما ہے اور پھر اس کی روشنی میں اپنے طرزِ فکر، طرزِ حیات اور عملی روش کو بدل دے۔ تو وُہ طبعی فطرت اور اجتماعی فطرت دونوں سے مطابقت پیدا کر سکتا ہے اور اپنی دُنیوی زندگی میں کامیاب و بامراد ہو سکتا ہے۔ قرآن کے نزدیک جو قومیں آیاتِ فطرت اور آیاتِ تاریخ کے مشاہدے سے اس بنیادی قانون کا علم حاصل نہیں کرتیں جو فطرت اور تاریخ کے اندر جاری و ساری ہے وُہ اپنی عملی زندگی میں ناکام تمدّنی حیثیت سے پست اور سیاسی اعتبار سے محکوم و مغلوب رہتی ہیں، کیونکہ وُہ اپنی زندگی میں ضروری اصلاحات و تغیّرات نہیں کر سکتیں۔ اِسی حقیقت کو قرآن یوں بھی بیان کرتا ہے :۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا (کافر وُہ ہیں) جو ہماری ملاقات کی اُمّید و آرزو سے
بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُم خالی اور دُنیا کی زندگی سے راضی اور خوش ہیں اور جو
عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۔ ہماری آیات (فطرت اور تاریخ) سے غافل ہیں۔

اِس آیت میں قرآن منجملہ اور علاماتِ کفر کے ایک علامتِ کفر یہ بھی قرار دیتا ہے کہ آدمی آیاتِ فطرت اور آیاتِ تاریخ یعنی حوادثِ طبعی اور انقلاباتِ تاریخ کی کُنہ و حقیقت سے بیخبر رہے اور ان کے بُنیادی اسباب پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ان سے سبق نہ لے سکے، اِسکی وجہ یہ ہے کہ کافر کائنات پر کسی ایک قانون کی فرمانروائی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ ہر واقعہ کو ایک جُداگانہ علّت کا اور ہر حادثہ

یا انقلاب کو کسی جزوی مشیّت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ واقعاتِ فطرت اور انقلاباتِ تاریخ میں جو عمومی مشیّت
اور عالمگیر قانون کارفرما ہے، اس تک ان کی نظر نہیں پہنچتی ہے، اسی وجہ سے وہ کثرت پرستی اور شرک
میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر وہ ہر واقعہ کو جزوی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اسے ایک سلسلہ کی کڑی سمجھیں
اور واقعات کے باہمی روابط پر غور کرکے ان کا عمومی قانون دریافت کر لیں تو وہ خود بخود کثرت
پرستی اور شرک سے باز آکر توحید یعنی ایک قانونِ واحد کی عالمگیر فرمانروائی کے قائل ہو جائیں
جس سے جملہ واقعاتِ عالم اپنی انفرادی صورت میں سرزد ہوتے ہیں۔ قرآن نے جو الزام کافروں
پر لگایا تھا، افسوس کہ اب مسلمان خود اس کے مورد مستحق ہو گئے ہیں۔ کیونکہ عقیدۂ توحید دراصل
وحدتِ قوانین (Unity of laws) کے تصوّر کا داعی ہے، اور خدا کے واحد ہونے کے
معنے یہ ہیں کہ اس کے تمام قوانین جو عالم میں سرگرمِ کار ہیں، ایک واحد قانون کے مختلف اجزاء
اور فروع ہیں، جس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ جملہ واقعاتِ عالم باہم ایک دوسرے
سے علّت و معلول کے رشتہ میں مربوط اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور ان کا صدور ایک
واحد اور آئین پسند مشیّت کے تحت ہوتا ہے۔ اب مسلمانوں کا طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ ہر واقعہ
کو خدائی جزوی مصلحتوں اور مختلف مشیتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے
کہ عالم میں جتنے واقعات ہیں اتنی ہی خدا کی مشیتیں ہیں اور ہر واقعہ کی ایک جداگانہ اور
منفرد علّت ہوتی ہے۔ اس طرح توحید کے مدّعی ہونے کے باوجود مسلمان ایک نئی قسم کی کثرت
پرستی اور جدید طرز کے شرک میں مبتلا ہیں۔ تعدّدِ آلہہ (Plurality of gods)
کے بجائے وہ تعدّدِ قوانین (Plurality of laws) اور لاتعداد مشیّتوں کے قائل
ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ کافر اقوام کی طرح ہماری موجودہ
مسلمان قوم بھی اس واحد مشیّت اور عمومی قانون کے فہم و ادراک سے عاجز ہو گئی ہے جس سے تمام
واقعاتِ فطرت اور انقلاباتِ تاریخ صادر اور وقوع پذیر ہوتے ہیں ؞

قرآن اور عملِ تاریخ

HISTORICAL PROCESS

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن عملِ تاریخ (Historical Process) کو قانونِ مکافاتِ عمل یا قانونِ جزا و سزا کا نتیجہ قرار دیتا ہے یعنی اس کا دعویٰ ہے، کہ قوموں کے اجتماعی اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے، ایک مقررہ وقت پر اپنے نتائج ضرور پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں قرآن پرانی قوموں کی تباہی کا ذکر کرتا ہے وہاں وہ اس امر کی تصریح کر دیتا ہے کہ ان قوموں پر جو تباہی نازل ہوئی وہ انکے اپنے اعمال کے سبب سے ہوئی۔ خدا کو ان کے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی۔ اگر یہ قومیں محض وجودِ الٰہی کا اقرار کر لیتیں اور اس کے قانونِ مشیت یا قانونِ حیات کی اسی طرح خلاف ورزی کرتی رہتیں، تب بھی انکے ساتھ یہی معاملہ پیش آتا کیونکہ ان قوموں کا اپنے پیغمبروں سے اصل جھگڑا یہ نہ تھا کہ اس کائنات کا کوئی بنانے والا ہے یا نہیں، بلکہ وہ اس حقیقت کے منکر تھے۔ کہ کائنات اور بالخصوص حیاتِ انسانی کا کوئی مخصوص قانون ہے جس سے عملی زندگی میں مطابقت پیدا کرنی ضروری ہے، کفّار کو خدا کے وجود یا اس کے ایک ہونے سے اتنا شدید انکار نہیں تھا جتنا اس ضابطہ حیات اور طرزِ فکر سے جو ذاتِ الٰہی کے تصوّر اور قانونِ مکافاتِ عمل یعنی جزا و سزا کے عقیدہ سے منطقی طور پر مستنبط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ خدا کو ماننے والی قوموں پر بھی اسی قسم کے عذاب آئے جو پرانی قوموں پر نازل ہو چکے تھے، جب انھوں نے خدا کو ماننے کا مطلب صرف یہ سمجھا کہ اس کے وجود یا اس کے ایک ہونے کا اقرار کرنا کافی ہے اور ان کا ذہن اس احساس و شعور سے خالی ہو گیا، کہ مشیّتِ الٰہی کے عمومی قانون اور اس سے پیدا ہونے والے ضابطہ حیات سے مطابقت بھی ضروری ہے۔ اقوامِ مابعد مثلاً عیسائیوں اور مسلمانوں نے ان عذابوں کو جن میں وہ مبتلا کئے گئے تھے۔ عذاب نہیں سمجھا، حالانکہ انہیں بھی اپنے اعمال کی پاداش اسی طرح ملی جس طرح عاد و ثمود اور

دیگر معتوب قوموں کو۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم اقوام کو فطری حوادث کی شکل میں سزا دی گئی کسی قوم پر باد و باراں کا طوفان آیا، کوئی زلزلوں سے تباہ ہو گئی، کسی پر پتھروں کی موسلا دھار بارش ہوئی۔ لیکن اوّل تو قرآن نے قدیم قوموں میں سے صرف چند اقوام کا ذکر کیا ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ بقیہ اقوام کی تباہی فوجی شکست یا اندرونی بغاوت کے سبب سے عمل میں آئی ہو، دوسرے اقوام قدیم مظاہر پرست تھیں اور کسی بات پر اس وقت تک یقین نہیں کرتی تھیں جب تک اس میں کوئی غیر معمولی، اور مافوق الفطرت خصوصیت نہ ہو، کیونکہ وہ قانونِ الٰہی کے فطری آثار و مظاہر اور اس کی عام اور مانوس شکلوں کو ذاتِ الٰہی کی طرف منسوب کرنا الوہیت کی توہین سمجھتی تھیں اس لئے انکی ذہنی سطح کے مطابق فطرت اور فاطرِ فطرت نے انکے لئے عذاب کا وہی طریقہ اختیار کیا جو ان کی سمجھ میں آسکتا تھا۔ اگر اس کے بجائے انہیں کسی اور طریقہ سے عذاب دیا جاتا، تو وہ اسے خدا کا عذاب ہی نہ تصور کرتیں لیکن جب انسانی فہم و شعور کا ارتقاء کا ایک خاص نوبت پر پہنچ گیا، اور انسانوں میں زیادہ تر قرآن ہی کی تعلیم کے باعث یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی کارسازی اور تصرف مافوق الفطرت واقعات و حوادث میں نہیں، بلکہ زندگی کے عام اور فطری واقعات میں موجود اور کارفرما ہے اور تاریخ کے عام واقعات و انقلابات سے بھی مشیّتِ الٰہی کا ظہور ہو سکتا ہے۔ تو قدرت نے عذاب اور پاداشِ عمل کا وہ طریقہ بھی بدل دیا، جو پہلی قوموں کے ساتھ خصوصیت سے برتا گیا تھا اب کسی قوم پر آگ اور پتھروں کی بارش سے عذاب نہیں آتا اور نہ کوئی قوم پوری کی پوری زلزلوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ قدرت کا قانونِ مکافاتِ عمل، اور تاریخ کا انتقام خونریز جنگوں، لڑائیوں، اندرونی فسادات اور داخلی انتشار و برہمی، فوجی بغاوتوں، اقتصادی بحران اور معاشی کساد بازاری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عوام الناس ان تباہیوں اور نقصانات کو عذابِ الٰہی تصور نہ کریں لیکن اصل حقیقت تو یہی ہے کہ یہ تمام ہنگامے، فسادات اور انقلابات ہمارے اپنے اعمال سے پیدا ہوتے ہیں اور تاریخ میں مکافاتِ عمل اور جزاء و سزا کا جو قانون کام کر رہا ہے یہ سب اسی کے مظاہر و نتائج ہیں چنانچہ قرآن نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عذابِ الٰہی کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور قدرت کسی ایک ذریعہ سے انسان کو سزا دینے پر مجبور نہیں ہے :-

قُل ھو القادرُ علیٰ اِن یبعثَ علیکمُ عذابًا من فوقکمُ او من تحتِ ارجُلِکمُ او یلبسُکمُ شیعًا ویذیقَ بعضُکمُ باس بعضٍ ۔

کہو کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ عذاب کو اوپر سے بھیجے یا نیچے سے لائے، یا تمھیں مختلف برسرِ پیکار گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دے اور اس طرح تم میں سے بعض کو بعض کی دشمنی اور سختی کا مزہ چکھائے ۔

اَب سوال یہ ہے کہ اگر قانونِ مکافاتِ عمل یعنی جزا و سزا کا قانون واقعاتِ تاریخ میں جاری و ساری ہے تو کیا اس کا فعل و اثر بالکل اسی طور پر ہوتا ہے جیسا کہ طبعی فطرت (. . . . . Physical Nature) میں قانونِ علت و معلول کا ۔

یہ امر واقعہ ہے کہ مادّی اشیاء پر وہی اثرات و کیفیات طاری ہوتی ہیں، جن کی سابقہ علّتیں مقتضی ہوں، اور نتائج ناگزیر طور پر ویسے ہی ہوتے ہیں، جیسے اسباب، نیز جو علّتیں کبھی مادّی وجود پر عمل کرتی ہیں۔ ان کے اثر کو وہ وجود از خود زائل نہیں کر سکتا . . جب تک کہ خارج سے کوئی اور بیرونی علّت مداخلت کرکے اس کے اثر کو تبدیل نہ کردے ۔ تو کیا اسی طرح جو قومیں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ایک مدت تک اسبابِ ہلاکت جمع کرتی رہی ہیں، وہ کسی نوبت پر اپنی روش اور طرزِ عمل کو بدل کر ان سابقہ علّتوں کے اثرات کو زائل کر سکتی ہیں جو انکو تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ ہاں ایسا ہوسکتا ہے ۔ بیجان مادّہ کے برعکس جو سابقہ علّتوں کے اثرات کو خود بدل نہیں سکتا ہے، قومیں اور جماعتیں اپنے طرزِ فکر اور طریقِ زندگی کو بدل کر اُن اسبابِ ہلاکت کو دفع کر سکتی ہیں۔ جو انکی سابقہ بداعمالیوں کے باعث جمع ہوتے رہتے ہیں، بالفاظِ دیگر قرآن کا دعویٰ ہے کہ قوموں اور جماعتوں کے حالات مادّی اشیاء کی حالتوں کے برعکس قانونِ علت و معلول کی مجبورانہ پیداوار نہیں ۔ یعنی قوموں کی تقدیر انکے اپنے ہاتھ میں ہے نہ کہ خارجی اسباب و حالات کے ۔ چاہیں تو اس تقدیر کو وہ اپنے عمل سے بدل دیں اور اپنی شقاوت و نامرادی کا دور ختم کرکے اصلاحِ اعمال کے ذریعہ فلاح و کامرانی اور عزت کی زندگی کا ایک نیا دور شروع کریں ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

اِنَّ اللّٰہ لَا یُغَیِّرُ مَا بقومٍ حتّٰی یُغَیِّرُوا ما بانفسِھِم ۔

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اُس وقت تک نہیں بدلتا ۔ جب تک کہ اُسکے افراد اپنے آپ کو نہ بدلیں ۔

اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ مادی اشیاء کے بالکل برعکس جن کی حالت بدلنے کیلئے کسی خارجی علت
کی مداخلت ضروری ہوتی ہے، انسانی معاشرہ کی اجتماعی تبدیلیاں بیرونی اسباب یعنی خداوند تعالیٰ کی
راست مداخلت کے ذریعہ عمل میں نہیں آتیں۔ انسان کی حیاتِ معاشری میں اگر کوئی تبدیلی واقع ہو سکتی
ہے، تو داخلی علتوں کے ذریعے سے یعنی نفس اجتماعی میں پہلے خود احساس تبدیلی پیدا ہونا چاہیئے اور
پھر اس احساس کی بنا پر مناسب کوششیں عمل میں آنی چاہئیں۔ اگر قوم اپنی حالت سے غیر مطمئن نہ ہو اور
تغیرِ حال کا تقاضا خود اسکے اندر سے نہ ابھرے، تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اس کی اصلاح نہیں کرتا
البتہ اگر لوگوں میں یہ احساس و شعور عام طور سے پیدا ہو جائے کہ ہماری ہیئتِ اجتماعی
(Social Structure) اصلاح طلب ہے۔ اور ہمیں اپنی ذاتی جد و جہد سے اس حالت
کو بدلنا چاہیئے، تو اللہ تعالیٰ اس جد و جہد میں ان کی امداد و معاونت کرتا ہے اور انکی کامیابی
کے لئے سازگار حالات پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح قرآن کا دعویٰ یہ ہے، کہ قومیں اصلاح احوال کے ذریعہ
اپنے اندر تغیر پیدا کر سکتی ہیں یعنی قوم کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور سابقہ حالات و اسباب سے
ذرہ بے بس اور مجبور نہیں ہے، کہ اگر سابق میں اس کا نشو و ارتقاء غلط اصولوں پر ہوتا رہا ہے تو آئندہ
بھی وہ انہیں خطوط پر چلتی رہے بلکہ وہ اپنے طرز عمل اور طرزِ فکر کو بدل کر اور سابقہ حالات و روایات اور
تعلیمات کے اثرات کو زائل کر کے ایک نئے دورِ حیات کا آغاز کر سکتی ہے البتہ یہ عمل اسکے اپنے
ارادہ سے ظہور پذیر ہوگا۔ خداوند تعالیٰ خارج سے اسکی تقدیر نہیں بدلے گا اور نہ بلاواسطہ اس کے
معاملات میں مداخلت کریگا۔ غرضکہ قرآن اس تقدیر پرستی کے علانیہ خلاف ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ قومیں
اپنی سابقہ روایات و حالات یا اپنی تاریخ کے اثرات و نتائج سے مجبور ہیں اور اصلاح اعمال یا
تغیرِ احوال کے ذریعہ اپنی قسمت بدلنے سے عاجز ہیں، اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن جغرافی اور
معاشی قوانین کو اتنا حتمی نہیں خیال کرتا ہے، جتنا آج کل کا علم جدید۔ موجودہ طرز فکر کی رو سے
معاشی حالات اور جغرافی اثرات قوموں کی زندگی، خیالات، طرزِ فکر اور عادات و اطوار پر غالب رہتے
ہیں، اور ان کے خطوط ارتقاء کو آخری اور قطعی طور پر متعین کر دیتے ہیں۔ جدید نظریات کے مطابق
کوئی قوم اپنے جغرافی ماحول، معاشی حالات اور تاریخی اثرات کے نتائج سے فرار نہیں کر سکتی اور
نہ اپنی آزاد مرضی سے کوئی دوسرا طرزِ فکر، طریقِ زندگی یا تمدن و معاشرت کا کوئی دوسرا

ڈھنگ اختیار کر سکتی ہے بجز اس طرزِ فکر، طریقِ حیات اور وضعِ معاشرت کے جو اس کے معاشی جغرافی اور تمدنی حالات کے قدرتی تقاضہ سے وجود میں آئے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ قومیں اپنے حالات کی تبدیلی پر قادر ہیں۔ چاہیں تو غلط راہوں سے مڑ کر سیدھی راہ پر آجائیں غلط طریقوں کو ترک کر کے صحیح طرزِ زندگی اختیار کر لیں، باطل افکار و تخیلات اور گمراہ کن عقائد کا جوا اُتار کر حق و صداقت پر استوار ہو جائیں۔ غرضکہ مجموعی حیثیت سے وہ اپنی قسمت کی تشکیل اور تقدیر کی صورت گری پر پوری طرح قادر ہیں۔

پھر قرآن ہمیں بتاتا ہے، کہ تاریخ کا یہ عمل کیونکر واقع ہوتا ہے جس کے مطابق قومیں بڑھتی اور گھٹتی ہیں۔ عروج حاصل کرتی اور پھر زوال و نکبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زمین کی وراثت یا قوموں کی لیڈر شپ ایک جماعت سے دوسری جماعت پر اور ایک گروہِ انسانی سے دوسرے گروہ پر کیوں منتقل ہوتی ہے۔ کیا یہ محض بخت و اتفاق، جغرافی حوادث اور معاشی حالات کی ساعدت کے باعث ہوتا ہے یا اس کی تہ میں کوئی اور راز پوشیدہ ہے یعنی اس عملِ تغیر اور انقلابِ قیادت کا کوئی قانون ہے یا یہ کسی اندھی بہری مشیت اور نامعلوم علت کا نتیجہ ہے؟ قرآن کے نظریہ کی رو سے زندگی اور کائنات کا کوئی شعبہ قانون کی گرفت سے آزاد نہیں اس لئے اس عروج و زوال اور رفعت و پستی کا بھی کوئی قانون ہونا چاہیئے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ وراثتِ ارضی اور انقلابِ امامت کا قانون کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی حسبِ ذیل آیات میں ملتا ہے:-

وقال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک والھتک۔ قال سنقتل ابناءھم ونستحی نساءھم وانا فوقھم قاھرون۔ قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔ قالوا اوذینا قبل	موسیٰ کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تم موسیٰ اور اسکی قوم کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دیدیگے تاکہ وہ زمین میں فساد برپا کریں اور تمہیں اور تمہارے معبودوں کو چھوڑ دیں فرعون نے کہا کہ ہم اُنکے لڑکوں کو قتل کر دینگے اور اُنکی عورتوں کو زندہ رہنے دینگے اور یہ یقینی ہے کہ ہم ان پر پوری طرح غالب و مقتدر ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر سے کام لو زمین تو دراصل اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وہ اس کا وارث بنا دیتا ہے

ان تاتینا و من بعد ما جئتنا قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون۔

اور کامیابی توبالآخر فانون خدا ونرا سے خوف کھانیوالوں کے لئے ہے۔ انھوں نے کہا ہم کو تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد ایذائیں دی گئیں۔ موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور تمھیں زمین کی خلافت عطا فرمائے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینٰت وما کانوا لیومنوا۔ کذٰلک نجزی القوم المجرمین۔ ثم جعلنٰکم خلٰئف فی الارض

اور ہم نے تم سے پہلے کی قوموں کو ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کیا انکے رسول انکے پاس کھلے ہوئے دلائل لیکر آئے لیکن وہ ایمان نہ لائے اسی طرح ہم مجرم قوموں کو سزا دیتے ہیں۔ پھر ہم نے زمین پر تم کو خلیفہ مقرر کیا، اور تم میں سے بعض کا درجہ بعض سے بلند کیا

بعضکم فوق بعض درجٰت لیبلوکم ما اٰتٰکم۔ ان ربک سریع العقاب وانہ لغفور رحیم

تاکہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے اس کے بارے میں تمہاری آزمائش کی جائے۔

وھو الذی جعلکم خلٰئف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجٰت۔ لیبلوکم فیما اٰتٰکم۔ ان ربک سریع العقاب وانہ لغفور رحیم۔

وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجے کی بلندی عطا فرمائی تاکہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس کے بارے میں تمہاری آزمائش کی جائے بیشک تمہارا رب تیزی سے سزا دینے والا ہے اور وہ رحم کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔

ان الذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ فسینفقونھا ثم تکون علیھم حسرۃ ثم یغلبون۔ والذین کفروا الیٰ جھنم یحشرون لیمیز اللہ الخبیث من الطیب۔

جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ اپنے اموال اللہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کیلئے خرچ کرتے ہیں وہ اسی طرح خرچ کرتے جائینگے پھر انکے لئے حسرت رہ جائیگی اور وہ مغلوب ہو جائینگے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم میں جمع کئے جائینگے تاکہ اللہ تعالے خبیث کو طیب سے تمیز کرے۔

ان الارض یرثھا عبادی الصٰلحون۔

زمین کی وراثت اللہ کے صالح بندوں کے ہاتھ میں آتی ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں حضرت موسیٰؑ کی زبان سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم زمین کی وراثت یعنی قوموں کی امامت جسے چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں کوئی قوم یہ خیال کرے کہ اسے دنیا کی لیڈرشپ کا اجارہ مل گیا ہے یا وہ وراثتِ ارضی کی مستقل حقدار ہے تو یہ محض اس کی کوتاہ فہمی ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں کہ انجام کار متقی گروہ کے ہاتھ میں ہے یعنی بالآخر وہی قوم غالب رہے گی اور اسی کو امامت عالم کی سرفرازی عطا ہوگی جس میں قانون مکافات عمل اور جزا و سزا کا خوف زیادہ ہو۔ اسی آیت کے آخری حصے میں حضرت موسیٰؑ یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بنی اسرائیل کو امامت اقوام اس لئے عطا فرمانا چاہتا ہے تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ تمہارا عمل کیسا ہوگا۔ دوسری آیت میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ قوموں کو دنیا کی لیڈرشپ اس لئے عطا کرتا ہے تاکہ انکے اعمال کی آزمائش کرے۔ پھر تیسری آیت میں بھی قرآن اسی دعویٰ کی تکرار کرتا ہے اور اب کی بار مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سابقہ قوموں کی طرح تمہیں بھی امتحاناً وراثت ارضی یا اقوامِ عالم کی لیڈرشپ دی گئی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ تم اس کے مستقل حقدار بن گئے ہو، یا تمہیں امامتِ عالم کا اجارہ مل گیا ہے۔ چوتھی آیت میں ایک اور بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ انقلاب امامت کا یہ تاریخی عمل اس لئے واقع ہوتا ہے تاکہ برے اور اچھے، خبیث اور طیب اور ظالم و عادل میں تمیز ہو جائے۔ پانچویں آیت میں قرآن ایک اور حقیقت پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ زمین کی وراثت اسی قوم کو ملتی ہے جو صالح ہو۔ یعنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے دوسری اقوام کی بہ نسبت افضل ہو۔ ان سب آیات کو اکٹھا کر کے تاریخی عمل (Historical Process) کے بارے میں قرآن کا نظریہ مستنبط کیا جائے، تو وہ یہ ہوگا۔ کہ اقوام عالم کی امامت اور زمین کی وراثت کسی مخصوص گروہ یا جماعت کا اجارہ نہیں ہے، کیونکہ خدا کو اس عمل سے قوموں کی آزمائش مقصود ہے یعنی خداوند تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ جو مادی، معاشی اور سیاسی وسائل کسی قوم کو اپنی برتری اور غلبہ کی وجہ سے حاصل ہو جاتے ہیں ان کا استعمال وہ کس طرح کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس عمل سے یہ واضح کرنا بھی مقصود ہے کہ کون سی قوم عادل ہے اور کون سی ظالم۔ کون طیب ہے اور کون خبیث۔ کیونکہ قوموں کے اجتماعی کردار اور اوصاف کا اظہار انکی تاریخ ہی سے ہوتا ہے۔ [illegible] وہ دوسری اقوام کے ساتھ معاملت کرتی ہیں اس سے انکی اخلاقی [illegible] نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے اسلئے واقعتاً تاریخ

یا عملِ تاریخ (Historical Process) ہی وہ آخری کسوٹی ہے جس پر اجتماعی نیکی اور بدی
اور اجتماعی فضائل یا رذائل پرکھے جا سکتے ہیں۔ جس قوم کو وراثتِ ارضی کی نعمت عطا کی جاتی ہے وہ
اپنے صالح، عادل اور اہل ہونے کا ثبوت ان واقعات تاریخ میں پیش کرتی ہے جو اس کی توسیع اور فتوحات
کے دوران میں پیش آتے ہیں۔ تاریخی عمل اور واقعات تاریخ کے ٹھوس شواہد سے دنیا پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے
کہ فاتح قوم مجموعی حیثیت سے زیادہ طاقتور، زیادہ عادل اور بہتر صفاتِ ذہنی و اخلاقی کی مالک تھی
اور مغلوب قوم کی شکست خود ہی اس کی داخلی کمزوریوں کا پردہ فاش کر دیتی ہے اس لئے قرآن کا
یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ عملِ تاریخ (Historical Process) کے ذریعہ خداوند تعالیٰ خبیث
اور طیّب کے درمیان امتیاز قائم کر دیتا ہے اسی وجہ سے کوئی مغلوب و مفتوح قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی
... کہ وہ اپنی پستی اور زبوں حالی یا اپنی محکومی اور محرومی کے باوجود محض اپنے زبانی عقیدہ یا کتابی
اصولوں کے باعث فاتح اور غالب قوم سے علم، اخلاق یا عقل کے اعتبار سے افضل ہے اس طرح
قوموں کی اخلاقی فضیلت یا پستی اور صلاحیت کار خود تاریخ کے عمل سے واضح ہو جاتی ہے یعنی تاریخ
کے انقلابات و تغیرات قانون انتخاب طبیعی (Natural Selection) کا ایک وسیلہ ہیں
جسکے ذریعہ فطرت ہر شعبۂ زندگی اور ہر سطحِ حیات میں ادنیٰ اور اعلیٰ کو ایک دوسرے سے چھانٹتی رہتی ہے
اسی انتخابِ طبیعی (Natural Selection) کو قرآن اپنی اصطلاح میں خبیث و طیّب کی
تمیز سے موسوم کرتا ہے اور انقلاب امامت کی توجیہہ اس طرح سے کرتا ہے کہ فطرت مختلف قوموں کو
یکے بعد دیگرے یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنی اہلیت، صلاحیت کار اور فضیلت اخلاق کا ثبوت مہیا
کریں جب تک وہ اپنے عمل سے اس آزمائش میں کامیاب رہتی ہیں۔ اور اپنی پاکیزگی اور اخلاقی
فضیلت کے معیار کو قائم رکھتی ہیں ان کے عروج کا دور جاری رہتا ہے لیکن جب انکے اخلاقی
اقدار [illegible] گرنے لگتے ہیں عیش و راحت طلبی کی وجہ سے انکی کارکردگی خراب ہو جاتی ہے۔
اور زینت و تفاخر کے مرض میں مبتلا ہو کر انکا مالدار اور با اثر طبقہ اپنے کمزور اور بے سہارا
ہم قوموں نیز دوسری محکوم اقوام کے حقوق پامال کرنے لگتا ہے تو ان کا دورِ اقبال ختم ہو جاتا ہے
اور وہ روز بروز زوال و نکبت کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔
غرضیکہ قرآن کی وہ تمام آیات جو اوپر درج کی گئی ہیں مسلمانوں کے اس نظریہ کے خلاف ہیں

کہ محض کلمہ گوئی یا اسلام کی ظاہری علامات اور رسوم وشعائر کی پابندی انکی دنیوی اور دینی نجات کی ضامن ہے، یا انہیں تاریخ کے اس انتقام سے بچا سکتی ہے جو کاہل، عیش پرست اور انفعالی خصوصیات (Passive qualities) رکھنے والی قوموں کی بربادی کا موجب ہوتا ہے۔

قرآن کے کسی بیان یا اشارہ سے یہ مستنبط نہیں ہوتا ہے، کہ اس نے مسلمانوں کو سنت الٰہی یا قوانین تاریخ کے عمل سے مستثنیٰ قرار دیا تھا، اور وراثتِ ارضی کا مستقل حقدار یا امامت عالم کا اجارہ بنا دیا تھا، قرآن نے صاف الفاظ میں مسلمانوں کو سنا دیا ہے، کہ بنی اسرائیل اور دوسری اقوامِ قدیم کی طرح تمھیں بھی امتحاناً زمین کی بادشاہت عطا کی جا رہی ہے۔ اگر تم اس بارِ گراں کے متحمل ہو سکے اور تمھارے اندر وہ خصوصیات باقی رہیں جو ایک غالب اور حکمران گروہ میں پائی جانی چاہیں، تو تمھیں باقی رکھا جائیگا۔ ورنہ تم بھی تاریخ کے انتقام کا شکار ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے وراثتِ ارضی اور تمکن فی الارض کے جو وعدے پیروانِ اسلام سے کئے تھے، وہ غیر مشروط وعدے نہیں تھے چنانچہ جب قرآن نے یہ اعلان کیا، کہ اللہ ایمان والوں اور نیک کردار لوگوں کو زمین کی خلافت عطا کریگا، اور انھیں تمکّن فی الارض کی سعادت سے ممتاز فرمائے گا، (وعد اللهُ الذین امنو و عملو الصٰلحٰت لیستخلفنّهم فِی الارض کما استخلف الذین من قبلهم و لیمکنّن لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم) تو اس نے جماعت مومنین کی خصوصیات و صفات بھی بیان کر دی تھیں اور یہ کہہ دیا تھا، کہ تم دنیا میں اسی وقت تک سربلند رہو گے جب تک ان صفات کے حامل ہو، وانتمُ الاعلون اِنْ کنتُم مومنین۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم مسلمان مومنوں کی صفات سے متصف ہیں یا ہمارے اندر اُن قوموں کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں جن کی قرآن نے مذمت کی تھی، اگر غور سے دیکھا جائے، تو مسلمانوں کی سوسائٹی میں اب وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر قرآن نے یہود و نصاریٰ کو مطعون کیا تھا، اور جن کی وجہ سے یہ قومیں عذاب شدید سے محروم کی گئیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کہ چونکہ وہ کلمہ گو ہیں اور ان میں اسلام کی چند ظاہری علامات اور رسمی عبادات پائی جاتی ہیں اس لئے تاریخ اُن کے ساتھ وہ انتقامی کارروائی نہیں کریگی جو ایک عالمگیر قانون کے تحت وہ دوسری قوموں کے ساتھ کرتی رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارا نظام معاشرت، ہماری معاشی زندگی، ہمارے کاروبار اور لین دین کے

طریقے اور ہمارے اخلاقی معیارات دُنیا کی دُوسری قوموں سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ہماری سوسائٹی میں جتنی عدم مساوات اَب پیدا ہو گئی ہے اتنی دُنیا کی اور کسی قوم میں مشکل پائی جاتی ہے۔ ہمارے امراء اور خوشحال طبقات اپنے طرزِ فکر، عادات و اطوار اور طریقِ رہائش میں عام مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ ہمارے اندر دولت، وجاہت اور عہدہ کی بنا پر جتنے امتیازات پائے جاتے ہیں ان سے دُنیا کی ہر ترقی پذیر قوم ناآشنا ہے۔ ہمارے یہاں محض قابلیت، دیانت یا صلاحیت کار کی بنا پر کوئی شخص زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتا ہے کیونکہ ہماری سوسائٹی میں مالدار اور بااثر طبقات کے ساتھ عام لوگوں کے مقابلہ میں ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے اور متوسط یا غریب افراد کو ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جاتا ہے۔ دولت کی پرستش اور عہدہ کی ہوس نے ہمارے لئے ایک معبود کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ہم زبان سے خدا کا نام لیتے ہیں اور اس کی عبادت کا دم بھرتے ہیں لیکن ہماری ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے جسم و ذہن کی تمام توانائیاں وسائلِ عیش اور اعزازِ دُنیوی کے حصول میں صرف کرتے ہیں اور عملاً انھیں مادی اور محسوس معبودوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اِس طرح ہم نے اصلی خدا سے منہ پھیر کر اپنے نفس کی باگ جھوٹے خداؤں کے ہاتھ میں دیدی ہے وہ بیباک حق گوئی اور حق شناسی جو مومنینِ اوّلین کا نشانِ امتیاز تھی، ہمارے اندر بالکل مفقود ہوگئی ہے، کیونکہ ہم کسی سچائی یا کسی اعلیٰ مقصد کیلئے اپنا ذاتی نقصان کرنا اور اپنے شخصی، خاندانی اور قبیلوی مفاد کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ ان حالات میں ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں، کہ ہمارے اندر اسلام اور ایمان کی وہ صفات موجود ہیں جو ہمیں تاریخ کے ہاتھوں تباہی سے محفوظ رکھیں گی، اور ہم اُن آفات و مصائب سے دور رہیں گے، جن میں غافل، عیش پرست اور دولت پر جان دینے والی قومیں ناگزیر طور پر مبتلا ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت ہماری تمام خرابیوں کی اصلی جڑ یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں قانونِ مکافاتِ عمل یعنی جزا و سزا کا خوف باقی نہیں رہا ہے جسے قرآن تقویٰ سے موسوم کرتا ہے۔ حالانکہ یہی صفت مذہب کی اصلی روح اور دین کی بنیادی اساس ہے ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جو قومیں تباہی کے قریب آن پہنچتی ہیں، اُن میں تقویٰ کی صفت معدوم ہو جاتی ہے یعنی انکے خوشحال اور بااثر اشخاص یہ سمجھنے لگتے ہیں، کہ سیاسی تدابیر، معاشی قوت اور فوجی طاقت کے ذریعہ وہ اپنی عیش پرستی، ظلم اور ناانصافیوں کے ناگزیر نتائج سے محفوظ رہینگے۔

تباہ شدہ قوموں اور رو بہ انحطاط طبقوں میں قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف یعنی تقویٰ کی صفت کیوں باقی نہیں رہتی ہے اور وہ یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ سیاسی حیلہ بازیوں، غلط پروپاگنڈے اور بے معنی مذہبی یا سیاسی نعروں سے وہ اپنے اعمال کی پاداش اور اپنی عیش پرستیوں کے نتائج سے محفوظ رہینگے، اس کا جواب بھی ہمیں قرآن ہی کے صفحات میں ملتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :—

واقسموا باللّٰہِ جھد ایمانھم لئن جاءھم
نذیرٌ لیکوننّ اھدیٰ من احدی الامم
فلمّا جاءھم نذیرٌ مازادھم الّا نفورًا
استکبارًا فی الارض ومکرَ السیّئ ۔
لا یحیقُ المکرُ السیّئُ الّا باھلہ فھل
ینظُرون الّا سنّتَ الاوّلین فلن تجد
لسنّتِ اللّٰہِ تبدیلاً ولن تجد لسنّتِ
اللّٰہ تحویلا۔ اولم یسیروا فی الارض
فینظُروا کیف کان عاقبۃُ الذین من
قبلھم وکانوا اشدَّ منھم قوۃ۔ وما کان
اللّٰہ لیُعجزہٗ من شیئٍ فی السمٰوٰت ولا
فی الارض ۔ اِنّہٗ کان علیمًا قدیرًا
ولو یؤاخِذُ اللّٰہُ النّاس بما کسبوا
ما ترک علیٰ ظھرھا من دابّۃٍ
ولٰکن یؤخّرُھم الیٰ اجلٍ مسمّی
فاذا جاءَ اجلُھم لا یستاخرون ساعۃً
ولا یستقدمون ۔

اور وہ بڑے زور کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ڈرانے والا آجائے تو وہ قوموں میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہونگے پھر جب ڈرانیوالا آگیا تو ہدایت پانے کی جگہ وہ اس سے روز بروز متنفر ہی ہوتے گئے یہ لوگ زمین میں تکبّر کیا کرتے تھے اور بُری تدابیر میں مصروف رہتے تھے حالانکہ بُری تدابیر کا وبال صرف اُن کے کرنیوالے پر پڑتا ہے۔ تو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اگلوں کے ساتھ کیا طریقہ برتا اور اللہ کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ہے اور کیا تم نے زمین کی سیر و سیاحت نہیں کی جو دیکھتے کہ اگلے لوگوں کا کیا انجام ہُوا، حالانکہ وہ قوت میں ان سے زیادہ تھے اور اللہ کو زمین و آسمان کی کوئی چیز (جزا و سزا کے عمل سے) تھکا نہیں سکتی، بیشک وہ جاننے والا اور قدرت رکھنے والا ہے اور اگر اللہ لوگوں سے انکے اعمال کا (فوری) مواخذہ کرے تو زمین پر کوئی جانور بھی باقی نہ رہے لیکن وہ اعمال کی جزا و سزا کو ایک مقرّرہ میعاد تک ملتوی کر دیتا ہے لیکن جب وہ میعاد ختم ہو جاتی ہے تو پاداشِ عمل میں (نہ) ایک گھڑی کی دیر ہوتی ہے اور نہ سویرے۔

اس آیت میں قرآن نے زوال آمادہ اور مائل بہ شکست قوموں کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی وہ مکر السیّئ یا بُری سیاسی تدابیر کے ذریعہ قانون مکافاتِ عمل

کی گرفت سے بچنا چاہتی ہیں، حالانکہ ایسی باطل اور فریب کارانہ تدابیر خوشنما اعلانات اور دلفریب نعروں کی زد بالآخر انھیں افراد اور طبقات پر پڑتی ہے جو انھیں اپنی حفاظت کے لئے استعمال کرتے ہیں پھر قرآن ان افراد و طبقات کی اس غلط فہمی کو بھی دُور کر دیتا ہے کہ وُہ اپنی معاشی قوّت سیاسی چالاکی یا فوجی قوّت کا استعمال کر کے اپنی بداعمالیوں اور مظالم کے نتائج سے بچ جائینگے چنانچہ وُہ کہتا ہے کہ تُم سے پہلے جن سرکش اور جابر طبقات و اقوام کو اُنکے کیئے کی سزا ملی اُن کی معاشی طاقت، سیاسی عیاری، اور فوجی قوّت تُم سے زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود چونکہ قانون مکافات عمل کی گرفت سے زمین و آسمان کا کوئی گوشہ آزاد نہیں، اس لئے انکی تمام ذہنی معاشی اور فوجی صلاحیتیں انکو پاداشِ عمل سے محفوظ نہ کر سکیں آیت کے آخری حصّہ میں اللہ تعالیٰ قانون مکافات عمل کے انداز کار کی وضاحت فرماتے ہوئے کہتا ہے کہ اس قانون کے مواخذہ سے تو کوئی بچ نہیں سکتا ہے لیکن لوگوں کو دھوکا اس لئے ہوتا ہے کہ انکے اعمال کے نتائج ایک مقررہ وقت سے پہلے ظاہر نہیں ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ہر بُرے عمل کا نتیجہ فوراً سامنے لے آئے تو بہت کم حیوانات اور انسان ہلاکت و تباہی سے بچ سکینگے اس لئے قانون الٰہی یہ ہے کہ انسانی بداعمالیوں کے نتائج کبھی تدریجاً جبر و تعویق کے ساتھ منظرِ عام پر آتے ہیں اور بُرے عمل کی سزا فوراً ہی نہیں ملتی ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ انسان کو اصلاح اعمال اور تغیرِ احوال کا موقعہ دیتا ہے تاکہ اگر وُہ اپنی روش و طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کرے تو اعمالِ بد کے نتائج سے محفوظ رہے لیکن جب قدرت کے اس انتظار و مہلت کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے اور لوگ حسب سابق اپنی بداعمالیوں اور خلاف ورزیوں پر مُصر رہتے ہیں، تو بالآخر ایک مقررہ وقت پر تاریخ اپنا انتقام لینا شروع کر دیتی ہے اور پھر عرصۂ دراز کی بداعمالیوں کے نتائج اتنی تیزی سے ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ اُنکے مرتکبین کو مزید اصلاح و ہدایت کا موقعہ نہیں ملتا ہے اس طرح ظالم اور عیش پرست طبقات و اقوام کو جو چیز قانون مکافات عمل سے بیخوف بنا دیتی ہے۔ وُہ اس قانون کی سُست رفتاری ہے اگر ہمارے سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی کردار کے نتائج فوراً ظاہر ہو جایا کرتے تو کسی شخص کو یہ دھوکا نہ ہوتا اور ہر انسان قانون مکافاتِ عمل کے نتائج کو ملحوظ رکھ کر کام کرتا لیکن سیاست و معاشرت اور اجتماع و تمدّن کے دائرہ میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ صرف جسمانی اُمور میں قُدرت کبھی تعجیل سے کام

لیتی ہے۔ چنانچہ قوانین جسم کی خلاف ورزی کے نتائج ہر فرد کو اپنی زندگی کے دوران ہی میں بھگتنے پڑتے ہیں مثلاً اگر ہماری غذا اور طرزِ رہائش اُصولِ صحت کے خلاف ہو تو اس کی پاداش میں ہمیں جسمانی کمزوری یا اور کوئی مرض لاحق ہو جائیگا۔ اگر ہم کھانے پینے میں ضروری احتیاط نہ برتیں، تو امراضِ معدہ میں مبتلا ہو جائینگے۔ اس طرح جسمانیات کے دائرہ میں قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کے نتائج جلد ہی سامنے آجاتے ہیں اور انسان کو موقع رہتا ہے کہ وہ اپنا طرزِ عمل بدل کر اور قوانینِ صحت کی پابندی کر کے اس سزا سے نجات حاصل کر لے۔ لیکن معاشرت و تمدّن اور قومی زندگی کے دائرہ میں جو روحانی امراض اور اخلاقی عوارض قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کے باعث پیدا ہو جاتے ہیں، ان کی تشخیص اور ان کا صحیح علاج اتنا آسان نہیں ... کیونکہ اس دائرہ میں قانونِ مکافات عمل بڑی سُست رفتاری سے کام کرتا ہے اور انسانی بداعمالیوں کے نتائج عرصہ دراز تک منظرِ عام پر نہیں آتے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جسمانی صحت و تندرستی اور جسمانی کمزوری کا تعلق فرد کی ذات سے ہے اور افراد کی عمرِ طبعی قوموں کی مدّتِ حیات کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے، چونکہ قدرت کو بقائے نوع کے لئے افراد کی بقا مطلوب ہے اور افراد کی عمرِ طبعی مختصر ہوتی ہے اسلئے جسمانی زندگی کے دائرہ میں قانونِ مکافاتِ عمل زیادہ تیز رفتاری سے کام کرتا ہے اور اس کے اثرات و نتائج اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ بہت کم لوگ انکو نظر انداز کر کے اپنی سابقہ روش پر اصرار کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کیونکہ اگر وہ قوانینِ صحت کی مسلسل خلاف ورزی کرتے رہیں اور اپنے امراض کا علاج نہ کریں تو جسمانی حیثیت سے ناکارہ ہو جائیں یا انہیں اپنی زندگی سے ہی ہاتھ دھونا پڑے اسلئے جسمانیات کے دائرہ میں قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف جسے ہم جسمانی تقویٰ کہہ سکتے ہیں، کم و بیش ہر فرد پر طاری رہتا ہے اور اسے قوانینِ صحت کی خلاف ورزی سے روکتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی اُمور میں افراد کی بہت بڑی اکثریت قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل یا قانونِ جزا و سزا پر جبلّتہً ایمان رکھتی ہے۔ چنانچہ جسمانی تندرستی کے اصولوں پر جس آدمی کا ایمان جتنا زیادہ پختہ ہوگا یعنی جس شخص کو جسمانیات میں قدرت کے قانونِ جزا و سزا پر جتنا زیادہ یقین ہوگا، وہ اُتنا ہی صحت مند اور طاقتور ہوگا۔ یا یوں کہیئے کہ جو آدمی جسمانی حیثیت سے جتنا زیادہ متقی ہوگا، اسی قدر وہ اپنی صحت اور طاقت کی حفاظت میں کامیاب رہے گا، تمدّن و معاشرت اور اجتماعی زندگی کے دائرہ میں اس کے برعکس قدرت کا معاملہ افراد سے نہیں بلکہ

قوموں اور جماعتوں سے ہوتا ہے جن کی عمر افراد کی عمر سے زیادہ طویل ہوتی ہے اسلئے نتائج بھی دیر سے
اور معاشرتی زندگی میں قانون مکافاتِ عمل کی رفتار بھی سست ہوتی ہے اور اجتماعی زندگی کے صحیح
اور فطری اصولوں کی خلاف ورزی کے نتائج دیر میں ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ معاشرتی اعمال کے اثرات
و نتائج ہماری ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ ایک وسیع دائرہ میں پھیل کر پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے
ہیں۔ اکثر اوقات ایک شخص ساری عمر نیکیاں کرنے کے باوجود انکے ثمرات سے مستفید نہیں ہوتا،
بلکہ اس کی اولاد اِن نیکیوں سے فائدہ اُٹھاتی ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں، کہ ایک شخص محنت و
مشقت اور ایثار و جفاکشی سے اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر روپیہ کماتا اور جمع کرتا ہے لیکن ابھی اس کی مالی
حالت پوری طرح درست بھی نہیں ہوتی، کہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور اس کی اولاد اپنے باپ
کے جمع کردہ سرمایہ سے فائدہ اُٹھاتی ہے حالانکہ اس کی جدوجہد اور محنت میں اولاد کا کوئی حصّہ نہیں
ہوتا۔ اسی طرح بعض وقت افراد کے اعمالِ بد کا نقصان خود اُنہیں نہیں پہنچتا۔ بلکہ آنے والی نسلوں
کو ان کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے مثلاً ایک شخص اپنا روپیہ پیسہ فضولیات میں اُڑا دیتا ہے، یا
باپ دادا کی پیدا کی ہوئی جائداد اور ملکیت کو اپنی عیش پرستی کی نذر کر کے اولاد کو مفلس و قلاش
چھوڑ جاتا ہے، اس کی آئندہ نسل جو اس کی بداعمالیوں اور عیش پرستیوں میں قطعاً شریک نہ تھی
اِن کرتوتوں کی وجہ سے بدحال اور مصیبت زدہ رہتی ہے۔ یہی حال انسان کے جسمانی اعمال کا بھی ہے
کہ ان کے نتائج صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی متاثر کرتے ہیں
جو لوگ اپنی لذت پرستی اور شہوت رانی کے باعث جسمانی اعتبار سے کمزور ہو جاتے ہیں انکی کمزوریاں
اولاد در اولاد آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اور زندگی کی جدوجہد میں انکے لئے سنگِ راہ
ثابت ہوتی ہیں اس کے برعکس بعض افراد اعتدال اور احتیاط کی زندگی بسر کرنے اور خواہشاتِ نفسانی
کا کامیاب مقابلہ کرنے کی وجہ سے زائد جسمانی طاقت حاصل کر لیتے ہیں، اور اس کا فائدہ صرف
انکی اپنی ذات کو نہیں پہنچتا، بلکہ آئندہ نسلیں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ قومی زندگی اور انسان
کی حیاتِ اجتماعی پر بھی یہی اُصول صادق آتا ہے۔ ایک قوم اپنی جدوجہد ایثار و قربانی اور
اجتماعی سرفروشیوں سے محکومی اور غلامی کی لعنت سے آزادی حاصل کرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں
کہ اس آزادی کے ثمرات و نتائج سے وہی نسل مستفید ہو جس نے آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیا تھا،

بلکہ اکثر و بیشتر اس جدّوجہد کے فوائد اُن افراد اور نسلوں کو حاصل ہوتے ہیں جن کا قومی آزادی کی کشمکش میں کوئی حصّہ نہ تھا۔ اس کے برعکس ایک دولتمند اور خوشحال قوم اپنی بداعمالیوں، عیش پرستیوں اور غفلتوں کے نتیجہ میں آزادی اور ترقی کی نعمتوں سے محروم ہوکر کسی فاتح گروہ کی غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس غلامی کی مصیبتیں ان لوگوں کو برداشت نہیں کرنی پڑتیں جنھوں نے عیش و لذّت کی ہوس میں گرفتار ہوکر اپنے مستقبل سے غفلت برتی تھی۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ عیش پسند اور غافل اسلاف تو آرام و چین کی زندگی بسر کرکے دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور اس کا وبال اُن کی آئندہ نسل پر پڑتا ہے۔ پس معلوم ہوُا، کہ قانون مکافاتِ عمل کا طریق کار افراد کے ساتھ اور ہوتا ہے اور قوموں کے ساتھ کچھ اور۔ قومی زندگی کی مدّت طویل ہوتی ہے اسلئے قومی کمال کے نتائج خواہ اچھے ہوں یا بُرے دیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور صرف ان لوگوں کو متاثر نہیں کرتے ہیں جنھوں نے واقعتاً ان کا ارتکاب کیا ہو، بلکہ آنے والی نسلیں جو ان اعمال میں شریک نہیں ہوتیں ان کے فوائد اور نقصانات سے متاثر ہوتی ہیں۔

انسان کی شخصی زندگی اور قوموں کی اجتماعی زندگی میں قانون مکافاتِ عمل کی کارکردگی کے فرق کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ جب ہم ایک چھوٹے سے تنگ نالے میں اینٹ یا پتّھر پھینکتے ہیں تو اس میں فوراً بڑی بڑی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں جو ہمیں صاف نظر آتی ہیں اور جن کے بارے میں ہماری نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی۔ اسکے برعکس اگر ہم ایک بڑے دریا میں پتّھر پھینک دیں تو اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوگا، بلکہ ہلکی ہلکی لہریں دکھائی دینگی، اور بہت ممکن ہے کہ یہ لہریں اتنی ہلکی ہوں، کہ ہمیں نظر ہی نہ آئیں اور ہم اس دھوکہ میں رہیں کہ شاید ہمارے پتّھر پھینکنے کا دریا پر کوئی اثر نہیں ہوا حالانکہ پتّھر تو پتّھر اگر ہم ایک کنکری بھی سطحِ آب پر پھینک دیں، تو وہ بھی اپنا اثر اور نتیجہ ضرور پیدا کریگی۔ اسی طرح چونکہ فرد کی زندگی محدود ہوتی ہے اسلئے اس کے جسمانی اعمال کا نتیجہ فوراً ظاہر ہوتا ہے، اور وہ اپنی زندگی کے دوران ہی میں اپنے اعمال کی جزا اور سزا کا مشاہدہ کرسکتا ہے لیکن قوم کی زندگی فرد کے مقابلہ میں لامحدود ہوتی ہے اس لئے افراد کے اجتماعی، قومی اور معاشرتی اعمال کے اثرات و نتائج بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور عرصہ تک عام انسانوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس لئے غافل اور عیش پرست قومیں یا ظالم طبقات کو یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ

تاریخ میں جزا وسزا کا کوئی قانون موجود اور کارفرما نہیں ہے اور انہیں اپنی بداعمالیوں کی پاداش نہیں ملیگی، پھر جب پیغمبر اور صاحبِ بصیرت افراد جو اسرارِ حیات سے واقف ہوتے ہیں انھیں اس غفلت پر متنبہ کرتے ہیں اور قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف دلاتے ہیں، تو ظالموں اور عیش پرستوں کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ وہ متوقعہ نتائج جن سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو آخر کیوں ہمارے سامنے نہیں آتے ہیں، اسی طرزِ فکر کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے ــ

ویستعجلونك بالعذاب ولولا اجلٌ مسمًّی لجاءهم العذاب ولیاتینّهم بغتةً وهم لا یشعرون۔

یہ لوگ عذاب کے بارے میں جلد بازی کرتے ہیں اور اگر نتیجہ کے لئے ایک میعاد مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب آچکا ہوتا انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ عذاب ضرور آئیگا اور اس طرح اچانک آئیگا کہ وہ بے خبر ہونگے۔

ویستعجلونك بالعذاب ولن یخلف اللّٰہ وعدہٗ وانّ یومًا عند ربّك كالف سنةٍ ممّا تعدّون۔

یہ لوگ تجھ سے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا ہے البتہ اللہ کا ایک دن تمھارے شمار کے لحاظ سے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے،

ویستعجلونك بالسیئة قبل الحسنة وقد خلت من قبلهم المثلٰت وانّ ربّك لذو مغفرةٍ للناس علی ظلمهم۔

یہ لوگ اچھائی سے پہلے تجھ سے برائی کیلئے جلدی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے عقوبتیں گزر چکی ہیں اور تیرا رب انسانی بدکرداریوں اور مظالم کے باوجود لوگوں کو معاف کرنے میں بڑا فیّاض ہے۔

ویقولون متٰی هذا الوعد ان كنتم صٰدقین قل عسٰی ان یكون ردف لكم بعض الذی تستعجلون انّ ربّك لذو فضلٍ علی الناس ولكنّ اكثرهم لا یشكرون۔

کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں ہے جس کا وعدہ تم کرتے ہو کہو کہ شاید وہ تمھارے پیچھے لگا ہوا ہو جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ انسانوں پر بڑا فضل کرنیوالا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے ہیں

ان آیات میں قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ غافل اور عیش پرست طبقات قانونِ مکافاتِ عمل کے نتائج پر یقین نہیں رکھتے ہیں، کیونکہ انکو بظاہر اپنی قوم اور سوسائٹی میں کوئی ایسی کمزوری یا خرابی نظر نہیں آتی جس سے انھیں شکست و تباہی کا اندیشہ ہو، حالانکہ انکی بداعمالیاں انکے لئے اسبابِ

شکست جمع کر رہی ہوتی ہیں۔ البتہ یہ ہلاکت اور تباہی جو قانون مکافاتِ عمل کے ناگزیر نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے چند مہینوں یا چند برسوں میں انکو نہیں لے ڈوبتی، بلکہ اس کے لئے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے شمار و حساب میں ایک ہزار سال بھی ہمارے ایک برس کی مانند ہیں۔ اسکے علاوہ افراد کی شخصی زندگی کی طرح قوموں اور طبقوں کی زندگی کا بھی اللہ نے ایک اندازہ مقرر فرما دیا ہے جب تک وہ وقت مقررہ نہیں آتا ہے اس وقت تک کسی قوم یا طبقہ کی بداعمالیوں کے پورے نتائج منظرِ عام پر نہیں آتے جو لوگ ان نتائج کو کامل طور پر رونما نہ ہوتے دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا قانون عذاب و ثواب اور فطرت کا قاعدہ جزا و سزا معدوم یا معطل ہے، وہ سخت دھوکہ کھاتے ہیں کیونکہ جس طرح طبعی اور جسمانی فطرت (Physical Nature) میں اسباب اور علتوں کے نتائج ہر لمحہ پیدا اور جمع ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک مقررہ وقت پر ان کا ظہور عمل میں آتا ہے اسی طرح قومی اور اجتماعی زندگی میں بھی افراد اور طبقات کے معاشرتی اعمال اپنے نتائج ضرور پیدا کرتے ہیں، اور اگر کوئی قوم یا طبقہ اپنی بداعمالیوں سے اسبابِ ہلاکت جمع کر رہا ہے تو اسکی پاداش کا جو مقررہ وقت ہے اور ظہورِ نتائج کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ قائم فرما دیا ہے اسکے مطابق وقتِ موعودہ پر تاریخ اپنا انتقام ضرور لیگی، البتہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کیلئے رحمت و مغفرت کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنا چاہتا ہے اور ظالم و بدکردار طبقات و اقوام کو اصلاحِ اعمال کی پوری پوری مہلت دینا چاہتا ہے اسلئے وہ پاداشِ عمل میں جلدی نہیں کرتا۔

تاریخ کے اس انتقامی عدل (Retributive Justice) کی آہستہ روی اور قانون مکافاتِ عمل کی سست رفتاری کا ایک سبب اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ افراد کی جسمانی زندگی کی مانند قوموں کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی میں بھی موت و حیات اور تعمیر و تخریب کی لاانتہا قوتیں ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کے خلاف کشمکش کرتی رہتی ہیں ہمارے جسم کے اندر زندگی اور ہلاکت کے متصادم میلانات ہر لمحہ اور ہر آن ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ ہم روزانہ ہزاروں بے احتیاطیاں اور قانونِ صحت کی لاکھوں خلاف ورزیاں کرتے ہیں لیکن ہمیں موت نہیں آتی کیونکہ زندگی کی قوتیں ہماری مساعدت کرتی ہیں اور موت کی طرف لیجانے والی قوتوں کے عمل کو منسوخ، معطل یا سست رفتار کر دیتی ہیں لیکن جب بڑھاپے میں زندگی کی قوتوں کا نشو و نما کمزور

پڑ جاتا ہے، تو تخریب و ہلاکت کی قوتیں غالب آکر ہمیں رفتہ رفتہ کمزور اور ضعیف کر دیتی ہیں یہاں تک کہ
جب حیات بخش میلانات بالکل معدوم ہو جاتے ہیں، اور فنا و ہلاکت کی قوتیں پوری طرح ہمارے
نظامِ جسمانی پر چھا جاتی ہیں، تو ہمارا جسمانی وجود فنا ہو جاتا ہے۔ یہی حال اقوام کا ہے کہ انکی
زندگی میں حیات بخش میلانات بھی ہوتے ہیں، اور ہلاکت آفرین رجحانات بھی، ابتدا میں
صحت افزا اور زندگی بخش میلانات نہایت قوی ہوتے ہیں۔ یہی زمانہ قوموں کے عروج اور نشو و نما
کا ہوتا ہے، پھر اسی زمانہ میں توسیع مملکت اور فتوحات ملکی کے باعث دولت ثروت اور عیش و
نشاط کے وسائل کی فراوانی کا آغاز ہوتا ہے جس کی وجہ سے قوم کے اجتماعی نظام میں ہلاکت
آفرین رجحانات داخل ہونے شروع ہو جاتے ہیں، لیکن انکی طاقت ابھی کمزور ہوتی ہے اور انکے
مقابلہ میں صحت افزا میلانات بہت قوی ہوتے ہیں، اسلئے اس زمانہ میں قوموں کے اندر زوال و
انحطاط کی کوئی ظاہری علامات نہیں پائی جاتیں، حالانکہ انکے زوال کی ابتدا ہو چکی ہوتی ہے
لیکن جس طرح آدمی بوڑھا ہونے کے بعد بھی کافی عرصہ تک گرتا پڑتا زندگی گزارتا رہتا ہے اسی
طرح قوموں کا دورِ زوال بھی عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر داخلی انتشار یا بیرونی
حملہ سے ان کا اجتماعی شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے، کہ کوئی قوم بیرونی حملہ آور یا
فوجی شکست کے ذریعہ تباہ نہیں ہوتی، جب تک کہ پہلے اس کی روح، اس کا ذہن، اس کی
داخلی قوتیں اور اندرونی نظامِ زندگی ضعیف اور زوال آمادہ نہ ہو جائے جب تک انسان
کے جسم میں قوتِ مدافعت رہتی ہے اس وقت تک بیرونی امراض کا حملہ اس پر کامیاب نہیں ہوتا
ہے، لیکن جب افراد کی داخلی جسمانی مزاحمت فنا ہو جاتی ہے، تو معمولی سے معمولی امراض انہیں
موت اور فنا کے دروازہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

اسی طرح قوم کی اجتماعی بداعمالیوں کے نتائج کا ظہور بھی حیات بخش میلانات کی موجودگی
میں ملتوی ہوتا رہتا ہے جبتک تعمیری قوتیں تخریبی میلانات کے عمل کو منسوخ، معطل یا ملتوی
کرتی رہتی ہیں۔ اس وقت تک اقوام اور جماعتوں کی بدکرداری کے نتائج منظرِ عام پر نہیں
آتے۔ اسی وجہ سے خوشحال اور مالدار طبقات کو یہ دھوکا ہوتا ہے، کہ تاریخ اپنے انتقامی عمل
سے غافل ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کا نظریہ ایک خالی خولی ڈھونگ ہے چنانچہ ہمارے

مغرب زدہ طبقات کو جب کبھی زناکاری، شراب خواری، عریانی، رقص و سرود اور عیش و نشاط کی گرم بازاری اور عورتوں مردوں کے آزادانہ اختلاط کے نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے تو وہ انگریزوں اور امریکہ کی مثال پیش کر کے یہ جواب دیتے ہیں۔ کہ ان قوموں میں تو یہ خرابیاں پورے زور و شور سے پھیلی ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور ان کا اجتماعی وجود محفوظ ہے۔ اگر عورتوں، مردوں کے آزادانہ میل جول اور رقص و سرود کی گرم بازاری سے قومیں تباہ ہو جایا کرتیں، تو انگریز اور امریکن اب تک برباد ہو چکے ہوتے۔ یہ لوگ اسی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ یعنی مغرب اور امریکہ کی زوال پذیر قوموں میں بعض صحت بخش میلانات ابھی تک اتنے قوی ہیں کہ انکی زناکاری، رقص و سرود، عیش و نشاط اور شراب خوری کے نتائج پوری طرح سے منظرِ عام پر نہیں آ سکتے ہیں۔ یہ زندگی بخش میلانات اس قسم کی بدکرداریوں کے اثرات کو منسوخ، معطل، یا کمزور کر دیتے ہیں۔ اوّل تو ان قوموں کی مادّی اور سائنٹفک برتری انکے قومی ضعف کی رفتار کو تیز نہیں ہونے دیتی۔ دوسرے ان میں قومیّت اور وطنیّت کا جذبہ اب بھی اتنا طاقتور ہے اور اس نصب العین سے ابھی تک ان کو اتنی گہری وابستگی ہے کہ انکے افراد اپنی قوم کی آزادی اور تحفظ کی خاطر جان و مال کی بڑی سے بڑی قربانی کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان تعمیری صفات کی موجودگی میں انکی تخریبی صفات اپنی طاقت کا پورا پورا مظاہرہ نہیں کر سکتے لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے۔ کہ شراب خوری، رقص و سرود، عیش و نشاط اور کثرتِ فواحش کے جو طبعی (Natural) اور معاشرتی (Social) نتائج نکلنے چاہئیں وہ برابر پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ قومیں ان خرابیوں سے پاک ہوتیں تو بہت عرصہ تک ان کی طاقت اور قوت کو کوئی دھکا نہ پہنچ سکتا اور وہ ان خطرات و آفات سے مدتِ دراز تک محفوظ رہتیں جو انکے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ مغربی ممالک بالخصوص اور امریکن قوم بالعموم زوال و انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے اور ان کی تہذیب سیاست چند دن کی مہمان ہے۔ پھر ہماری جیسی قوم جس میں نہ سائنس ہے نہ علم ہے اور نہ جوشِ قومی جو صدیوں سے بادشاہوں امیروں اور متموّل طبقات کی غلامی میں مبتلا رہنے کی وجہ سے آزادی کی روح اور جمہوریت کی روایات سے ناآشنا ہو چکی ہے اگر انھیں خرابیوں میں مبتلا ہو جائے جن میں انگریز اور امریکن مبتلا ہیں، اگر

ہمارے یہاں بھی زناکاری اور اختلاطِ مرد و زن عیش و نشاط اور رقص و سرود کا وہی زور و شور ہو جائے جو مغربی اقوام میں ہے تو کیا ہم ایک دن بھی میزانِ حیات میں اپنا وزن قائم رکھ سکیں گے۔ پھر جو لوگ ہمارے معاشرہ میں ان خرابیوں کو پھیلانا چاہتے ہیں یا اُن کے پھیلاؤ کو خوشی خوشی گوارا کر لیتے ہیں، کیا وہ ہماری قوم کو زوال اور موت کی دعوت نہیں دے رہے ہیں؟

ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے جو قانونِ مکافاتِ عمل کے نتائج کو ظاہر نہ ہوتے دیکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شراب نوری، زناکاری، عیش پرستانہ عادات کی کثرت یا کمزوروں کے حقوق کی پامالی سے کچھ نہیں ہوتا ہے، اور ہمیں تو اِن باتوں کے باوجود زوال و بربادی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے، قرآن فرماتا ہے:۔

ولو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر لقضی الیھم اجلھم۔	اگر اللہ لوگوں کے ساتھ بُرائی (نتائج بد کے ظہور) میں اتنی ہی جلدی کرتے جتنی جلد بازی وہ اچھے کاموں کا اجر طلب کرنے کے لئے کرتے ہیں تو ان کی مقررہ میعاد فوراً ختم ہو جائے۔
وربک الغفور ذوالرحمۃ لو یؤاخذھم بما کسبوا لعجل لھم العذاب بل لھم موعد لن یجدوا من دونہ موئلا۔ وتلک القری اھلکناھم لما ظلموا وجعلنا لمھلکھم موعدا۔	اللہ تعالیٰ تو معاف کرنیوالا اور رحم کرنیوالا ہے، ورنہ اگر وہ بُرے کاموں پر لوگوں کی گرفت کرے تو اُن پر فوراً عذاب بھیج دے جس کے مقابلہ میں وہ کوئی پناہ نہ پائینگے اور یہ آبادیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کیا لیکن ہم نے اُن کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔
ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمی فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔	اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے ظلم کا مواخذہ کرنے پر آتا تو روئے زمین پر ایک جاندار بھی باقی نہ رہنے دیتا لیکن وہ ایک مقررہ وقت تک (ظہورِ نتائج) کو ملتوی رکھتا ہے پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی کی بھی پس و پیش نہیں ہو سکتی

اِن آیات میں قرآن نے قانونِ مکافاتِ عمل کے طریقِ کار اور فطرتِ انسانی کی خصوصیات کے بارے میں بعض لطیف نکات بیان کئے ہیں۔ اوّل تو وہ کہتا ہے کہ ہر واقعہ اور ہر نتیجہ کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے اور اس وقتِ موعودہ سے پہلے نہ تو کوئی واقعہ وقوع پذیر اور نہ کوئی نتیجہ ظہور پذیر

ہو سکتا ہے یہ وقت اللہ کے ایک اندازہ پر موقوف و منحصر ہوتا ہے۔ جسے قرآن اپنی اصطلاح میں تقدیر کہتا ہے :۔

وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا ہم نے ہر شے کو بنایا اور پھر اُس کیلئے ایک اندازہ مقرر کیا

اسی وقتِ مقررہ کو قرآن کہیں اجل کہتا ہے اور کہیں موعد کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ انسانی اعمال کے پورے نتائج کبھی وقتِ مقررہ سے پہلے نہیں ظاہر ہوتے۔ باقی یہ حقیقت تو موجودہ سائنس کی رُو سے بھی ثابت ہے کہ ہر سبب اپنا نتیجہ اور ہر علت اپنا معلول ضرور پیدا کرتی ہے۔ مادّہ کی حرکت کے مانند انسان کا ہر فعل یہاں تک کہ اس کا کوئی ذہنی تصور اور خیال بھی بے اثر اور بے نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ بات کہ وہ نتیجہ فوراً سامنے نہیں آتا اور بظاہر اس کا کوئی خارجی اثر محسوس نہیں ہوتا انسان کو اس دھوکہ میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا۔ حالانکہ اس کا ظہور اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج کا مشرق سے طلوع ہونا۔ لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں معاشرتی زندگی میں متضاد اسباب و نتائج اور مخالف علتیں ایک دوسرے کے اثر کو منسوخ، معطل یا کمزور کرتی رہتی ہیں۔ اس لئے بعض اسباب کے نتائج روپوش رہتے ہیں اور اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے فعل و ظہور کو روکنے والے اسباب درمیان سے نہ ہٹ جائیں۔ قوموں کی حیاتِ اجتماعی در اصل قوتوں کا ایک متوازیہ (Parallelogram of forces) ہے جس میں ایک قوت دوسری کو دفع کرتی رہتی ہے اور بالآخر اس قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے جو مجموعی قوتوں کے ٹکراؤ کے بعد بچ رہتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دوسری قوتیں موجود ہی نہ تھیں یا تھیں تو بے اثر اور بے نتیجہ رہیں۔ تو یہ دعویٰ اس کے قصورِ فہم کی غمازی کرتا ہے قوتیں تو سب موجود تھیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا نتیجہ الگ الگ ظاہر نہیں ہوا بلکہ مجموعی نتیجہ (Resultant) منظرِ عام پر آیا۔ معاشرتی زندگی میں اس مجموعی نتیجہ کے ظاہر ہونے کے لئے کچھ وقفہ درکار ہوتا ہے جس کو قرآن اجل کہتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ وہ اپنی محنت اور مشقت، اپنی جد و جہد اور اپنے اعمال خیر و شر کے نتائج جلد ظاہر ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے حالانکہ حیاتِ اجتماعی چونکہ افراد کی محدود اور مختصر زندگی پر نہیں بلکہ کئی ایک نسلوں کی زندگی پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے

اِس کے دائرہ میں انسانی اعمال اپنا نتیجہ دو ایک روز میں نہیں بلکہ عرصہ دراز کے بعد پیدا کرتے ہیں
ایک فرد کی شخصی زندگی ساٹھ ستر سال سے زیادہ کی نہیں ہوتی، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنی قلیل
مدت میں ان اعمال کے نتائج کا مشاہدہ کرے جس میں اس نے اور اس کے اسلاف کی کئی ایک نسلوں
نے حصہ لیا ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے لوگ قرآن کی زبان میں استعجال یعنی جلد بازی
کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے اچھے اور بُرے کاموں کے نتیجے جلد انکے سامنے آجائیں انسان
کی اسی بے صبری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے :—

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھلوعًا۔ اذا مسَّہُ
الشرُّ جزوعا واذا مسَّہُ الخیرُ منوعًا
الّا المصلّین الذین ھُم علی صلاتھم
دائمون والذین فی اموالھم حقٌ
للسائل والمحروم والذین یُصدّقون
بیوم الدین والذین ھم من
عذاب ربّھم مشفقون۔

انسان کو بے صبر پیدا کیا گیا ہے جب اُسے کوئی بُرائی ستاتی
ہے تو مضطرب ہو جاتا ہے اور جب اچھا زمانہ آتا ہے بھلائی
سے رُکنے لگتا ہے بجز اُن لوگوں کے جو عبادت پر ہمیشگی
اختیار کرتے ہیں جو اپنے مالوں میں محروموں اور ناداروں
کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ جو جزا و سزا کے دن
کی تصدیق کرتے ہیں اور اپنے رب کے عذاب سے
ڈرتے رہتے ہیں۔

یہاں قرآن نے انسان کی فطری بے صبری اور جلد بازی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کمزوری
سے وہی لوگ بری ہو سکتے ہیں جنھیں خُدا کے قانون جزا و سزا پر اعتقاد ہو اور جن کو یہ یقین ہو کہ
اعمال کے نتائج ضرور بالضرور ظاہر ہو کے رہیں گے۔ جو اشخاص قانون مکافات عمل کی قطعیت کے
نہیں مانتے اور کائنات میں جزا و سزا کا جو غیر مختتم مگر غیر مرئی سلسلہ جاری ہے اس کے احساس
و شعور سے خالی ہیں، انکی حالت یہ ہوتی ہے جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے کہ نیکی کرتے ہیں اور
اس کا کوئی عمدہ نتیجہ فوراً ظاہر نہیں ہوتا، یا اسکی وجہ سے کوئی عارضی دشواری اور مصیبت پیش
آجاتی ہے تو فوراً مایوس ہو کر نیک عملی سے باز آجاتے ہیں کیونکہ نیک اعمال کی جزا اور انعام کا
یقین ان کے اندر پختہ نہیں ہوتا اسی طرح جب اُنکو دولت و ثروت یا طاقت حاصل ہو جاتی ہے
تو انھیں اچھے کاموں سے کوئی رغبت نہیں رہتی بلکہ دوسروں کو بھی وہ نیک عملی سے روکنے
لگتے ہیں کیونکہ قانون مکافات عمل کی قطعیت اور جزا و سزا کی لافانی حقیقت پر ان کا ایمان

متزلزل ہوتا ہے، وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ چونکہ انکی بداعمالیوں کے نتائج فی الفور سامنے نہیں آئے اسلئے یہ نتائج
کبھی ظاہر ہی نہ ہونگے، اور کائنات میں مکافاتِ عمل کا کوئی قانون ہی نہیں، یا ہے تو سیاسی تدابیر اور
حیلہ جوئی یا معاشی اقتدار و قوّت کے ذریعہ اس کے نتائج سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اس طرح دولت اور اقتدار
کا غرور انسان کے اعتقادِ جزا و سزا کو کمزور اور متزلزل کر کے اسے اپنے اعمال سے غافل اور احتسابِ نفس سے
بے پروا بنا دیتا ہے۔ اسی بے صبری کی وجہ سے انسان جزا و سزا، انعام و عقوبت اور ثواب و عذاب کو فوراً
اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے، اور جب انکے ظہور میں دیر ہوتی ہے تو نیک کرداری کے اچھے نتائج سے
مایوس ہو کر تعمیری اقدار اور تخلیقی مقاصد کی جدّ و جہد چھوڑ بیٹھتا ہے اور بُرے کاموں میں جو تملیکی جذبات
(Acquisitive Desires) کے اثر سے وجود میں آتے ہیں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کے
برخلاف جو لوگ حقیقتِ حیات سے باخبر اور قوانینِ کائنات سے آگاہ ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں
کہ نیکی سے فوراً کتنی ہی تکالیف ہوں اور اعمالِ خیر وقتی حیثیت سے کتنی ہی محرومیوں کے موجب ہوں بالآخر
ایک نہ ایک روز اپنا انعام ضرور لائینگے، اسی طرح بدی اور بدعملی کے نتائج خواہ ان کا ظہور فوراً عمل میں
نہ آئے کبھی نہ کبھی ضرور بھگتنے پڑینگے، جس شخص کا ایمان و اعتقاد یہ ہو اور جسے قوانینِ حیات کی ایسی بصیرت
حاصل ہو وہ نیکی اور عملِ خیر پر ہر صورت اور ہر حالت میں قائم رہتا ہے اگرچہ اس کے نتائج ناخوشگوار معلوم
ہوں اور بدی اور بدکرداری کے عذاب سے اس وقت بھی ڈرتا رہتا ہے جبکہ بظاہر اس کے ظہور کا کوئی
امکان نظر نہ آئے۔ تاریخ کی اصلاحی اور انقلابی جماعتیں اس اعتقاد میں بڑی پختہ ہوتی ہیں کہ اعمال کے
فطری نتائج ضرور ظاہر ہونگے، اور انکے دشمن خواہ کتنے ہی قوی ہوں اپنی بدکرداریوں کے باعث ایک
روز ضرور مغلوب و مفتوح ہونگے، اسی عقیدہ کے باعث وہ اپنے طاقتور مخالفین کے تمام مظالم و شدائد
کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں، اگر اعمال کی جزا و سزا کا یہ عقیدہ اتنا مضبوط اور استوار نہ
ہو، تو انکے لئے انقلابی جدّ و جہد کی صبر آزما صعوبتوں سے کامیاب نکل آنا، ناممکن ہو جائے، البتہ یہ
اور بات ہے کہ غیر مسلم انقلابی گروہ اس جزا و سزا کو اسی دُنیا سے متعلق سمجھتے ہیں اور آنحضرت صلّی
اللہ علیہ وسلّم کی انقلابی جماعت یعنی صحابہؓ اس ثواب و عذاب اور انعام و عقوبت کو دُنیا اور
آخرت دونوں سے متعلق سمجھتے تھے ۔

قوانینِ تاریخ اور عقیدۂ توحید کا باہمی تعلق

قرآن نے بت پرستی اور مشرکانہ رسُوم کو اقوام کے زوال و ہلاکت کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے متعدد مقامات پر بتایا ہے، کہ جن قوموں پر عذاب نازل ہوا، اُن میں پہلے نبی بھیجے گئے جنھوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ حیات اور قوانینِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی لیکن کفّار و مشرکین نے ان نبیوں کا مذاق اُڑایا، انکی تکذیب اور خلاف ورزی میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا اور اپنی بُت پرستی پر بدستور قائم رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ بالآخر وہ زوال و انحطاط میں مبتلا ہو کر تاریخ کے اسٹیج سے غائب ہو گئیں۔ بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شرک و بُت پرستی کا قومی انحطاط و زوال سے اور عقیدۂ توحید کا جسم قومی کی صحت مندی اور اجتماعی ترقی سے کیا تعلق ہے لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان کا باہمی تعلّق صاف واضح ہو جائیگا، شرک و بُت پرستی انسان کے اس توہم پرستانہ اعتقاد کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کی فلاح و سعادت کا کوئی ضابطہ یا قانون نہیں ہے جس طرح چاہو زندگی بسر کرو قومی طاقت اور اجتماعی شیرازہ بندی میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ کیونکہ کائنات اور انسان کی فطرت اجتماعی کسی قانون کی پابندی کا تقاضہ نہیں کرتی جس کی خلاف ورزی مہلک نتائج پیدا کرے، جن قوموں کا عقیدہ یہ ہو اُن میں قانون مکافاتِ عمل کا خوف باقی نہیں رہتا ہے اور وہ اس یقین سے تہی دامن ہو جاتی ہیں کہ تاریخ انسانی بدکرداریوں کو معاف نہیں کرتی، بلکہ ان کا شدید ترین انتقام لیتی ہے، ایسی قومیں صرف باطل تصوّرات سے ڈرتی ہیں اور غلط سہاروں پر زندگی بسر کرتی ہیں کہیں کسی ایسی چیز کو قومی زندگی کے لئے خیر و سعادت کا موجب سمجھ لیتی ہیں جس کا اجتماعی فلاح سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا، کہیں ایسی باتوں سے ڈرنے لگتی ہیں جن کے کرنے نہ کرنے سے کوئی بُرا نتیجہ پیدا نہیں ہوتا، بعض اشیا، مقامات یا مواقع کو منحوس اور بعض کو مبارک تصوّر کر لیا جاتا ہے بعض مظاہرِ فطرت کو مفید اور بعض کو نقصان

رساں قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس طرح جن باتوں سے واقعی ڈرنا چاہیئے۔ ان سے مشرک قومیں نہیں ڈرتیں بلکہ بیکار نمائشوں اور بیجا خوف وہراس میں مبتلا ہو کر اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں ایسے اعمال اور ایسی کوششوں میں ضائع کر دیتی ہیں جن سے قوم یا سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، جو چیزیں فی الحقیقت قومی زندگی کو نقصان پہنچاتی ہیں، مثلاً عیش پسندانہ عادات لذّت اور دولت کی غیر معمولی ہوس اور تعمیری کاموں سے عدم دلچسپی اُن سے کوئی فرد خوف نہیں کھاتا۔ اسی طرح تاریخ میں مکافاتِ عمل، جزا و سزا اور عذاب و ثواب کا جو غیر محسوس سلسلہ جاری ہے اس کا شعور بھی مضمحل ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ بے اصل باتوں سے خوف کھانا اور اتفاقی حوادث و مظاہر کو اپنی الفتوں اور وابستگیوں کا مرکز بنا لینا، ایسی اقوام کی ایک مشترکہ خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ تمام خرابیاں در اصل اس غلط عقیدے سے پیدا ہوتی ہیں۔ کہ انسان کی فطرتِ اجتماعی کسی مستقل قانونِ حیات کی مقتضی نہیں، جس سے مطابقت پیدا کرنا، اجتماعی فلاح و صلاح کیلئے ضروری ہو، اور تاریخ کے واقعات کسی عمومی قانون یا مشیّت کے تحت وجود میں نہیں آتے، بلکہ ہر واقعہ کی ایک جداگانہ علت ہوتی ہے۔ اور ہر حادثہ کے پسِ پشت ایک مستقل مشیّت کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح شرک و بت پرستی کے باعث قومیں تاریخ اور مشیّت الٰہی کے عمومی قانون کا تصوّر کھو بیٹھتی ہیں۔ صرف ظاہری عبادات، خارجی مراسم اور چند مخصوص قومی شعائر کی پابندی کو بقائے حیات کا وسیلہ سمجھ لیتی ہیں، اور زندگی میں جو چیز واقعی کلیدی اور بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یعنی اچھے اعمال، اخلاق، سیرت کی مضبوطی اور اصول و قوانین کی پابندی ان کی طرف سے ایک عام غفلت برتی جانے لگتی ہے جس کا نتیجہ زوال و ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

عقیدۂ توحید کا انسان کی حیاتِ قومی اور ہیئتِ اجتماعی سے جو گہرا تعلق ہے اُسے واضح کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف آر، ایچ ٹاؤنر (R. H. Towner) اپنی کتاب (Philosophy of Civilization) میں لکھتا ہے :—

"غیر مرئی اور غیر محسوس حقائق کی پرستش کا انسان کے ارتقائے عقلی سے بڑا گہرا رشتہ ہے غیب پر ایمان لانا اور اَن دیکھی چیزوں پر یقین رکھنا، انسان کی روحانی ترقی کا ایک حقیقی پیمانہ ہے تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلی حیثیت سے وہی قومیں ترقی پذیر ہیں جنھوں نے اپنی روحانی قوت کے ذریعہ غیر مرئی حقائق کا ادراک کیا، چنانچہ تاریخ سے حسبِ ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں"—

بنی اسرائیل

ایک اَن دیکھے خدا کا یقین بنی اسرائیل کا وہ نمایاں وصف تھا جو انھیں اپنی ہمسایہ اور ہمعصر قوموں سے ممتاز کرتا تھا، بنی اسرائیل کی روحانیت اور مادّی ترقی میں عروج و زوال اسی نسبت سے ہوا جس نسبت سے انہوں نے اَن دیکھے خدا پر اعتقاد پیدا کیا یا اس اعتقاد سے دستبرداری اختیار کی۔ جن لوگوں نے سنہرے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی حضرت موسیٰ نے انھیں بنی اسرائیل میں سے خارج قرار دیکر قتل کروا دیا۔ اسی واقعہ کے بعد سے بنی اسرائیل کی حیاتِ قومی میں مادّی ترقی اور نشوونما کے آثار نظر آنے لگے، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، یوشعؑ، صموئیلؑ، دانیالؑ غرضیکہ بنی اسرائیل کے تمام عقلا اور دانشور وہی لوگ تھے جن کا اعتقاد اَن دیکھے خدا پر بہت پختہ تھا، عام لوگوں کی عقلی پسماندگی نے انہیں کئی مرتبہ شرک و بُت پرستی اور توہم پرستی میں مبتلا کیا، حضرت سلیمانؑ کی پرشکوہ حکومت کے بعد بنی اسرائیل شہوت پرستی، انسانی قربانیوں اور محسوس و مشہود دیوتاؤں کی پرستش میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے پیغمبروں نے شخصی حیثیت سے اَن دیکھے خدا کا دامن نہیں چھوڑا لیکن بنی اسرائیل کے عام افراد بُت پرست ہی رہے۔

یونان

یونانی عقل جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی گئی، اسی قدر وہ محسوس اور مادّی اشیاء کے بجائے مجرد تصوّرات و حقائق (Abstractions) کی پرستش کرنے لگی فیثاغورس نے حیات کے بنیادی قانون کا نظریہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ قانون حیات اور جذبات کی رسائی سے ماوراء ہے، اس کا وجود غیر مرئی اور صرف انہیں افراد کے لئے قابل فہم ہے۔ جو مجرد تصوّرات قائم کر سکیں سقراط ہمیشہ تجریدی تصوّرات ...... (Abstract Conceptions) کی تلاش کرتا اور ذہنی تجریدات کی اہمیت پر زور دیتا رہا لیکن غیر مرئی اشیاء پر یونانی ذہن کو جو قدرت حاصل تھی اس کا سب سے بڑا ثبوت خود یونانی زبان ہے جو تجریدی حقائق کے اظہار کیلئے دوسری تمام زبانوں سے زیادہ موزوں ہے۔

روم

بنی اسرائیل کی مانند روما کے باشندوں کو بھی یہ تعلیم دی گئی تھی کہ وہ تصاویر یا بتوں کی پرستش نہ کریں۔ پلوٹارک اپنی مشہور کتاب سوانح (Plutarch's Lives) میں لکھتا ہے کہ نوما نے رومیوں کو تاکید کی تھی کہ وہ خدا کی ہستی کو جانوروں یا انسانوں کی شکل

نہ ہیں، رومی تاریخ کے ابتدائی ایک سو ستر سال تک کسی تصویر یا مجسمّہ کا وجود رومیوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اِن کے مندر بتوں اور مجسموں سے پاک تھے، اور ان کا عام اعتقاد یہ تھا کہ خدا کی ہستی کو محسوس اور مرئی صورت دینا اس کے تقدّس پر دھبّہ لگانے کے مترادف ہے۔ مامسن (Mommsen) کی تاریخ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رومیوں کے ابتدائی طریقِ پرستش میں خدا کی تصویر یا اس کی کسی محسوس اور مرئی شکل کا وجود نہ تھا۔ اسی طرح رومی عبادت کے اغراض کیلئے کوئی علیحدہ مندر یا عبادتگاہ نہیں بناتے تھے۔ بعض لاطینی قبائل نے دیوتاؤں کے جو بُت تراشے تھے، وہ غالباً یونانیوں کی تقلید تھی اور بعض مقامات پر انکے چھوٹے چھوٹے مندر بھی تھے لیکن اس قسم کی تصویر آرائی اور بت سازی کو نوما کے قوانین کی خلاف ورزی خیال کیا جاتا تھا اور اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک بدعت ہے جو غیر قوموں سے مستعار لی گئی ہے۔ خود رومی مذہب نے خدا کی کوئی مرئی اور محسوس شکل نہیں قائم کی تھی۔

عیسائی

قدیم ترین عیسائی نسلی اور قومی حیثیت سے یہودی اور حضرت موسیٰؑ کے قانون کے پیرو تھے جس نے تصویر سازی اور مجسمّہ تراشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی کسی مادّی یا محسوس شکل کی پرستش نہیں کی اپنی پوری زندگی میں تجرّد (Harnack) حقائق پیش کرتے ہے۔ تصاویر اور مجسموں کے احترام کا چرچا عیسائیوں میں چوتھی صدی کے بعد شروع ہوا۔ اس صدی کے ختم پر عیسائیوں کی انحطاط پذیر قوم کیلئے ایک غیر مرئی خدا کی پرستش دشوار ہو گئی اور انھیں عبادت کے اغراض کیلئے مادّی اور محسوس اشیاء کی حاجت ہوئی۔ چنانچہ ولیوں مقبروں اور تبرکات کا غیر معمولی احترام اسی زمانہ کی پیداوار تھا لیکن عیسائیوں کے بت پرستانہ میلانات انہی علاقوں میں زیادہ نمایاں تھے جو رومی تہذیب و تمدّن کا مرکز بن گئے تھے۔ وحشی جرمن[1] اقوام جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کیا، بالطبع بت پرستانہ میلانات سے نفور تھیں اسی طرح مشرق و مغرب کے دور دراز صوبے جہاں رومی تہذیب کی روشنی بہت کم پھیلی تھی، بت

ح ۱ بعد میں یہی جرمن اقوام رومی عیسائیوں کی حاکم بن گئیں اور انکے ملک میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئیں کیونکہ رومی عیسائیوں کے برعکس جو حضرت عیسیٰؑ کی خالص توحید کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے، جرمن فاتحین تصاویر کی پرستش نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اُن کے اندر اولیاء اور بزرگوں کی کرامات اور تبرکات کے متعلق کوئی خاص عقیدہ پایا جاتا تھا۔

پرستی اور مشرکانہ رسوم سے نسبتاً پاک تھے۔

مسلمان | مسلمانوں اور عیسائیوں میں بارہ سو سال تک جو کشمکش جاری رہی اس کی تاریخ بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ بت پرستی اور مشرکانہ رسوم قوموں کو فوجی شکست اور اجتماعی انتشار کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کی پہلی صدی میں انھیں ہر مقام پر عیسائیوں کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی، کیونکہ اس زمانہ کے عیسائی شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے اور اس کے بالمقابل مسلمان خالص توحید کے علمبردار تھے جو ابتداءً شرک کی تمام آمیزشوں سے پاک تھی جب مسلمانوں اور عیسائیوں میں بت پرستی اور شرک کا زور قریب قریب برابر ہوگیا، تو مسلمانوں کی فتوحات کا دور ختم ہوگیا۔ اس کے بعد مسلمان اور زیادہ مائل بہ شرک ہوتے گئے دوسری طرف عیسائیوں نے رفتہ رفتہ بت پرستانہ اور مشرکانہ رسوم سے توبہ کرلی اس وقت سے عیسائی مسلمانوں پر غالب آنے لگے فلسطین کی ارض مقدس جس طرح یکے بعد دیگرے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان منتقل ہوتی رہی وہ بالکل اسی ریاضیاتی قانون (Mathematical Law) کے مطابق تھی۔"

آگے چل کر یہی مصنف اس امر کی عقلی توجیہہ بھی پیش کرتا ہے۔ کہ شرک و بت پرستی سے قومیں کیوں زوال و بربادی کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور توحید خالص ان کے اندر کیوں ترقی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"تجریدی تصورات کی پرستش انسانی ذہن کو آزاد کردیتی ہے۔ جن بچوں کو عبادت کیلئے کسی مرئی اور محسوس شکل کا توسط نہیں ملتا، وہ مجبوراً اپنے معبود کا کوئی خیالی تصور پیدا کرتے ہیں خدا کی ذات و صفات کے بارے میں انہیں جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے انھیں اپنے معبود کا تصور آراستہ کرنے میں مدد تو ملتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفات عقلی ہوتی ہیں اور کسی محسوس و مجسم صورت میں انکے سامنے نہیں آتیں اسلئے ہر فرد اور ہر نسل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبود کا تصور خود قائم کرے، کیونکہ کوئی بنا بنایا مکمل اور محسوس و مشہود معبود اس کے پیش نظر نہیں ہوتا ہے۔ اس تصور کو قائم کرنے اور اس کے خد و خال معین کرنے میں ہر فرد اور ہر نسل کو دماغی کاوش کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے اس کی عقل ترقی پذیر رہتی ہے۔ توحید کے پرستاروں کی ہر نسل کا معبود اپنی پیشتر نسل کے معبود سے جدا ہوتا ہے اس طرح عقلی آزادی برقرار رہتی ہے۔ اور انسانی ذہن پابہ زنجیر

نہیں ہونے پاتا، جب کبھی عقل و تفکر کا طوفان اُمڈتا ہے، تو وہ پہلے کے تعمیر کردہ بند کو توڑ کر آگے
نکل جاتا ہے۔ بت پرستی اس ارتقائے فکر کا راستہ ہر طرف سے روک دیتی ہے، ایک بت جسے وہی
تقدس حاصل ہو گیا ہو جس کی پرستش زمانہ دراز سے معین و مقرر ہو، اور جسے از روئے قانون
سنت تصور کر لیا گیا ہو، وہ ہر نئی نسل کو ذہنی حیثیت سے ایک خاص سطح پر روک رکھتا ہے۔ اور
کسی فرد یا نسل کے لئے یہ غیر ممکن ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی روایات اور پرستش کے معینہ طریقوں
سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کرے، صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن اصنام پرست اقوام کے بُت بلا ترمیم
و تبدیلی، اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔ وہ اختلاف و تنوع جو ایک غیر مرئی خدا کے تصور سے پیدا ہوتا ہے
بُت پرستوں اور مشرکوں کی سوسائٹی میں ناممکن ہے۔ ہر نسل کو یہ سکھانے کے بجائے کہ تم اپنے معبود کا
تصور خود آراستہ کرو، اُسے صرف یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھیں استعمال کر کے اپنے معبود کو
اس کے تخت پر بیٹھا ہوا دیکھے جہاں وہ صدیوں سے مسند نشین ہے۔"

اس توجیہہ و تشریح میں ہم اپنی طرف سے اتنا اضافہ کریں گے کہ خدا پرستی اور توحید اسی صورت
میں قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے مفید و سودمند ہو سکتی ہے، جب اس کے ساتھ مشیت الٰہی
کے قانون کا بھی کوئی تصور موجود ہو، جو قومیں صرف خدا کے وجود کو تسلیم کر لیتی ہیں خواہ وہ
خدا مرئی ہو، یا غیر مرئی محسوس شکل میں پیش نظر ہو، یا غیر محسوس شکل میں، لیکن خدا کے تصور سے
اس کی مشیت کے عمومی قانون کا جو تصور مستنبط ہوتا ہے اُسے تسلیم نہیں کرتیں، ان کی خدا پرستی
کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ ایسی قوموں کا خدا بھی ایک بُت بن کر رہ جاتا ہے اگرچہ یہ بُت خیالی
اور تصوری ہوتا ہے اور اس کی کوئی ظاہر تصویر نہیں بنائی جاتی۔ ۔ ۔ ایسی قوموں میں تقویٰ کی صفت
نہیں پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ تقویٰ در اصل قانون مکافات عمل کا خوف ہے، پھر اگر یہ تصور ہی نہ
موجود ہو، کہ خدا کا کوئی مستقل قانونِ حیات یا اس کی کوئی عمومی مشیت بھی ہے جس کے ساتھ
مطابقت پیدا کرنا قومی اور اجتماعی زندگی کی فلاح کے لئے ضروری ہے تو خدا کا وجود ایک
شخصی اور انفرادی وجود بن جاتا ہے۔ اور اس کی محبت بھی ایک معین اور مشخص ہستی کی محبت ہو
جاتی ہے، نہ کہ اس قانونِ زندگی، اس تصورِ حیات اور طرزِ فکر کی محبت جو خدا کی عمومی مشیت
سے وجود میں آتا ہے۔ پھر چونکہ قانون مکافاتِ عمل پر جو مشیتِ الٰہی کے عمومی قانون کی

ایک فرع ہے، لوگوں کو اعتقاد نہیں رہتا۔ اس لئے نہ وُہ نیکی کے خوشگوار نتائج کی توقع سے پُراُمید ہو سکتے ہیں، اور نہ بدی اور بدکرداری کے نتائج سے خوف کھا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خُدا پر ایمان لانا اس کے قانون جزا و سزا پر ایمان لانا ہے۔ اگر جزا و سزا کے قانون کا اعتقاد نہ ہو تو خُدا کو ماننا اور نہ ماننا یکساں ہے لیکن یہ بھی یاد رہے۔ کہ اس جزا و سزا کا تعلق صرف عالمِ آخرت سے نہیں ہے بلکہ اسی دُنیا میں اعمال کی جزا و سزا انسان کو انفرادی اور قومی حیثیت سے ملتی رہتی ہے اس لئے جو قومیں جزا و سزا اور عذاب و ثواب کو صرف آخرت سے متعلق سمجھتی ہیں وُہ رہبانیت میں مبتلا ہو کر عذابِ الٰہی کی مستحق بن جاتی ہیں، خُدا کا قانون جزا و سزا تاریخ کے ہر دَور میں اپنے نتائج ظاہر کرتا ہے۔ جو قومیں دُنیوی حیثیت سے ترقی کرتی ہیں وُہ بھی اسی قانون کے مطابق آگے بڑھتی ہیں۔ جو قومیں جہالت، افلاس اور غلامی میں مبتلا ہو کر ذلّت و پستی کے قعر میں گرتی ہیں۔ ان پر بھی یہ دُنیوی عذاب اسی قانون کے مطابق نازل ہوتا ہے، لہٰذا خُدا کا تصوّر در اصل ایک عمومی اور کلّی قانون کا تصوّر ہے۔ جس کے مطابق اجتماعی فلاح و ترقی اور اجتماعی زوال و شکست کے تاریخی مظاہر رُونما ہوتے ہیں۔ اگر انسان کا ذہن اس کلّی اور عمومی قانون کے تصوّر سے خالی ہو، تو اس کی خُدا پرستی بھی بُت پرستی ہے ❊

اجتماعی انحطاط کے قرآنی قوانین

زوال پذیر اور شکست آمادہ اقوام کی ایک خصوصیت جس پر قرآن نے بار بار روشنی ڈالی ہے۔ انکی طبقاتیت ہے یعنی انکے اندر طبقاتی تفریق اور امیر و غریب کا امتیاز نہایت تند۔ بلاور مکروہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور طبقاتی تقسیم اتنی گہری مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ ایک طبقہ اور دوسرے طبقہ کے خیالات و افکار، معتقدات، طرز رہائش اور طریق زندگی میں کوئی مناسبت یا مشابہت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حسب ذیل آیات قرآنی میں زوال پذیر قوموں کی طبقاتیت کا ذکر کیا گیا ہے :۔

فقال الملأ من قومه الذين كفروا
وكذبوا بلقاء الآخرة واترفناهم
في الحيوة الدنيا ما هذا الا بشر مثلكم
ياكل مما تاكلون منه ويشرب مما
تشربون ولئن اطعتم بشرا مثلكم
انكم اذا لخاسرون۔ ايعدكم انكم اذا متم
وكنتم ترابا وعظاما انكم مخرجون
هيهات هيهات لما توعدون
ان هي الا حياتنا الدنيا نموت
ونحيا وما نحن بمبعوثين۔

نوح کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے خدا کا انکار کیا اور آخرت کی
تکذیب کی اور جنہیں ہم نے زندگی کا عیش دے رکھا تھا کہنے لگے
کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارا ہی جیسا ایک انسان ہے
جو تم کھاتے ہو یہی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو یہی پیتا ہے اگر
تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کی تو گھاٹے میں
رہو گے کیا یہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد مٹی
میں مل جاؤ گے اور تمہاری ہڈیاں تک گل جائینگی تو وقت
پھر تمہیں زندہ کیا جائیگا کیسی حیرت انگیز بات ہے جس کا یہ تم
سے وعدہ کرتا ہے زندگی تو بس یہی زندگی ہے اسی میں مرنا ہے اور
جینا ہے اور یہ کبھی ہوگا کہ ہم موت کے بعد پھر اٹھائے جائیں۔

ان آیات میں قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ سچائی کا انکار کرنے والے وہی لوگ تھے جنہیں خدا نے عیش و دولت کے وسائل سے بہرہ مند کیا تھا اور جو اپنی سوسائٹی میں لیڈروں کی حیثیت رکھتے

تھے۔ اس طرح قرآن نے یہاں ایک زوال پذیر طبقہ کا ذکر کیا ہے، پوری قوم کا ذکر نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن قومی اور اجتماعی زندگی کی طبقاتی[صلے] ہیئت (Class structure) کو بھی تاریخ کا ایک اہم عامل (Factor) قرار دیتا ہے، کیونکہ اس کی اکثر آیات میں رسولوں سے سرکشی اور قانونِ الٰہی سے انحراف کے عمل کو قوم کے بڑے بڑے مالدار افراد کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ ذیل کی آیت میں بھی قرآن ایک خاص طبقہ کو انکار و الحاد کیلئے مورد الزام قرار دیتا ہے:۔

وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون۔	اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا بجز اسکے کہ اس آبادی کے خوشحال طبقہ نے علانیہ کہنا شروع کیا کہ جس پیغام کو تم پیش کرتے ہو ہمیں اسکی صداقت سے انکار ہے

حضرت نوحؑ کے واقعہ میں بھی قرآن انکی قوم کے بڑے بڑے سرداروں کے علاوہ عام لوگوں کا تذکرہ نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے بالا طبقات اپنے غریب ہم قوم افراد کو بڑی حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

فقال الملأ الذین کفروا من قومہ ما نراک الا بشرا مثلنا وما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای۔	قوم نوحؑ کے وہ سردار جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہنے لگے کہ ہم تو تمھیں اپنے ہی جیسے آدمی کی صفات دیکھتے ہیں اور تیری بات ماننے والوں میں ہم انھیں کی تعداد زیادہ دیکھتے ہیں جنکو ہماری سوسائٹی میں ذلیل اور بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔

فرعون اور حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں بھی قرآن تمام مصریوں کے بجائے فرعون اور اسکے سرداروں کا ذکر کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ بانیٔ فساد اصل میں یہی طبقہ تھا اور حضرت موسیٰؑ کے خلاف فرعون کی جو کشمکش جاری تھی اس میں عوام الناس کا کوئی حصہ نہ تھا، چنانچہ

صلے قرآن انقلاباتِ تاریخ میں سوسائٹی کی طبقاتی ہیئت (Class structure) کو کافی اہمیت دیتا ہے لیکن کمیونزم کے برخلاف وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف طبقاتی جنگ ہی تاریخ کا فیصلہ کن عنصر ہے اور نہ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ طبقات کے وجود کو بالکل فنا کر کے ایک خالص لاطبقاتی (Classless) معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے البتہ وہ یہ کہتا ہے کہ جب بالا طبقات سوسائٹی کے غریب، کمزور افراد کے حقوق کو پامال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اُن میں استکبار کی صفت پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ قوم کے متوسط الحال اور غریب افراد کے بالمقابل اپنی برتری و تفوق کی نمائش کرنے لگتے ہیں اور انکی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں اس وقت قوم بحیثیت مجموعی زوال اور تباہی کی طرف جانے لگتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں:—

وقال موسیٰ ربّنا انك اٰتيت فرعون وملاءه زينةً واموالاً في الحيوٰة الدنيا ربّنا ليُضلّوا عن سبيلك -

اور موسیٰؑ نے کہا کہ اے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دُنیوی زندگی کی دولت اور زینت عطا کی ہے تاکہ وُہ تیری راہ سے دُور ہو جائیں -

یہ بات کہ قوموں میں گمراہی، ظلم اور کفر و شرک کے بانی مبانی زیادہ اونچے طبقہ کے لوگ ہی ہوتے ہیں قرآن کی حسب ذیل آیات سے بھی ظاہر ہوتا ہے:—

اذْ تبرّا الذين اتبعو من الذين اتّبعو وراو العذاب وتقطّعت بهم الاسباب وقال الذين اتبعولو انّ لنا كرّةً فنتبرّاءُ منهم كما تبرّؤ منّا

جب وُہ جنھیں لیڈر بنایا گیا تھا ان سے بیزار ہو جائینگے جو انکے پیرو تھے اور عذاب کو دیکھینگے اور انکے تعلقات کٹ جائینگے اور وہ جو پیرو تھے کہینگے کاش کہ ہمارے لئے دنیا میں پھر واپس جانا ہوتا، تو ہم اپنے لیڈروں سے بیزار ہوتے جس طرح وُہ آج ہم سے بیزار ہیں -

وقالو ربّنا انّا اطعنا سادتنا وكبراءنا فاضلّونا السبيلاً ربّنا اٰتهم ضعفين من العذاب -

اور اُنھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنے لیڈروں اور بڑوں کی پیروی کی تو اُنھوں نے ہم کو سچی راہ سے ہٹا دیا اے ہمارے رب تو انکے عذاب کو دوگنا کر دے -

اِن آیات پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو دو چار باتیں صاف نظر آئینگی ایک یہ کہ زوال پذیر اور تباہ شدنی اقوام میں طبقاتی تفریق اتنی شدید اور نمایاں صُورت اختیار کر لیتی ہے کہ دولتمند اور خوشحال طبقات اپنی ایک الگ اور مستقل قوم بنا لیتے ہیں اور عوام الناس کو نفرت و تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں، ایسے طبقات تو ہر زمانہ میں رہتے ہیں اور اسی طرح دولت و غربت کا فرق اتنیا بھی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور موجود رہتا ہے لیکن جب قوم مبتلائے شکست و ریخت ہوتی ہے تو دولتمند طبقات اور عامۃ الناس کی زندگی میں اتنی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے کہ قوم کے کرتا دھرتا اور رہنما اکثریت کے خیالات و افکار اور جذبات و احساسات سے بالکل بیگانہ اور ناآشنا ہو جاتے ہیں، انکے مصائب و تکالیف انکی حاجات و ضروریات اور انکی شکایات حکمران طبقہ کے کانوں تک پہنچنے ہی نہیں پاتیں، یا پہنچتی ہیں تو ہزاروں واسطوں در واسطوں سے اور بالکل غلط

اور مسخ شدہ صورت میں جب کسی قوم کے مختلف طبقات میں ایسی وسیع اور ناقابل عبور خلیج حائل ہو جائے کہ عوام کی زندگی اور حکمران طبقہ کی زندگی کا کسی ایک نقطہ پر بھی اتصال نہ ہو سکے اور دونوں اپنی اپنی جگہ ایک علیحدہ اور مستقل قوم بن جائیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم کی تباہی کا وقت آن پہنچا ہے

سابقہ آیات میں قرآن نے گمراہ اور زوال آمادہ طبقات کی ایک اور صفت کا بھی ذکر کیا ہے جسے وہ اتراف کہتا ہے یعنی خوشحالی کا غرور اور دولت کی سرمستی۔ چنانچہ اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں سے اکثر آیتوں میں زوال پذیر قوموں اور طبقوں کی اس خصوصیت کا ذکر موجود ہے۔ اسکے علاوہ حسب ذیل آیتوں میں بھی قرآن نے اسی صفت کی نشاندہی کی ہے:۔

واذا اردنا ان نهلك قريةً امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرًا

اور جب ہم کسی آبادی کو تباہ کرنیکا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اسکے خوشحال طبقات کو حکم دیتے ہیں پھر وہ خوب دل بھر کر فسق و فجور کرنے لگتے ہیں تو ان پر ہمارا قول پورا ہو جاتا ہے اور ہم اس آبادی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔

وكم اهلكنا من قريةٍ بطرت معيشتها فتلك مساكنهم لم تسكن من بعدهم الا قليلاً۔

اور کتنی ہی آبادیوں کو ہم نے تباہ کر دیا جنھیں اپنی معیشت پر غرور ہو گیا تھا، تو یہ ان کے مسکن ہیں جن میں ان کے بعد بہت کم لوگ رہ گئے۔

فلولا كان من القرون من قبلكم اولو بقيةٍ ينهون عن الفساد في الارض الا قليلاً ممن انجينا منهم واتبع الذين ظلموا ما اترفوا فيه وكانوا مجرمين۔

پھر کیوں تم سے پہلے کی آبادیوں میں اچھے عمل والے لوگ نہیں ہوئے جو ملک میں فساد کو روکتے ہاں تھوڑے سے ایسے لوگ ہیں جنھیں ہم نے نجات دی اور جو ظالم تھے وہ آسائش اور خوشحالی کے غرور میں بدمست رہے اور یہی لوگ مجرم تھے۔

ان آیات میں قرآن معاشی وسائل کی فراوانی اور اسباب عیش کی کثرت کو عذاب الٰہی کی وجہ اور زوال قومی کا سبب قرار دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم پر زوال و انحطاط کا عمل اسی وقت شروع ہوتا ہے جب وہ معاشی اعتبار سے خوشحالی کے درجہ تک پہنچ چکی ہو،

اور اس کے افراد میں اپنی مادّی ترقی اور معاشی برتری کا غرور پیدا ہو گیا ہو۔ ایسے دور میں خوشحال قوم کے افراد اپنے دست و بازو اور اپنی اعلیٰ اخلاقی صفات پر بھروسہ کرنے کے بجائے مال و دولت اور معاشی طاقت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگتے ہیں ۔ مادّی ترقی کے لاتعداد مواقع اور حصولِ دولت کے بیشمار ذرائع کی موجودگی میں مالدار اور خوشحال طبقوں کے افراد اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے اسلاف مادی وسائل اور معاشی طاقت کا جو عظیم الشان ورثہ ان کے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کے حصول میں انکے اخلاقی اوصاف ان کی محنت و دیانت انکی مشقت اور جفاکشی ان کی کفایت شعاری اور سادگی اور انکے باہمی تعاون اور ہمدردی و مساوات کا بڑا دخل تھا ، اسلئے یہی اوصاف اور سیرت و کردار کی یہی اعلیٰ خصوصیات قوم و ملّت کا اصل سرمایہ ہیں ، نہ کہ وہ معاشی وسائل اور مادّی طاقتیں جو ان اخلاقی اوصاف سے ضمناً پیدا ہو گئی ہیں اس حقیقت سے پہلو تہی کے باعث وہ اپنے اخلاقی کردار کی فضیلت پر نہیں بلکہ مادّی وسائل اور معاشی قوتوں پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں جس سے انکی اخلاقی حالت رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگتی ہے ۔ ایمانداری اور دیانت کی جگہ بے ایمانی ، محنت و مشقّت کی جگہ کاہلی اور آرام پسندی ، جرأت کی جگہ بزدلی ، کفایت شعاری کی جگہ اسراف اور سادگی کی جگہ ظاہری آرائش و زیبائش کا شوق بڑھنے لگتا ہے ۔ پھر اس طرزِ زندگی کے باعث سوسائٹی میں ظلم ، ناانصافی اور زبردست آزاری کی صفات پرورش پاتی ہیں کیونکہ ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ محنت و مشقت اور تعمیر و تخلیق کے بغیر محض اپنی پوزیشن اور اثر سے دوسروں پر سبقت لے جائے ۔ پھر ان اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے جو خطرات سامنے آتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے قوم اپنی معاشی طاقت اور مادّی برتری پر اعتماد کرتی ہے ، حالانکہ یہ ظاہری وسائل اور قوتیں اعتماد کے قابل نہیں ہوتی ہیں کیونکہ قوم کا اصلی سرمایہ جس پر واقعتاً بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس کا اخلاقی کردار ہے اور یہی سرمایہ دولت اور عیش کی فراوانی کے سبب ضائع ہو چکا ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط سہاروں پر اعتماد کرکے قوم اپنی شکست اور تباہی کا وقت قریب تر لے آتی ہے ۔

طبقاتی تفریق اور اتراف کے علاوہ شکست پذیر اقوام کی ایک اور صفت جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے ان کا استکبار ، ظلم اور علو ہے ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :۔

فلما جاءتهم آیاتنا مبصرۃً قالوا هذا سحرٌ مبین وجحدوا بها واستیقنتها انفسهم ظلمًا وعلوًا۔

جب ہماری نشانیاں انکے پاس آئیں کھلے طور پر تو انھوں نے کہا کہ یہ صریح جادو ہے اور ظلم اور تکبر سے ان کا انکار کیا حالانکہ دل میں انھیں یقین تھا کہ یہ نشانیاں صحیح ہیں۔

وقارون وفرعون وهامان لقد جاءهم موسیٰ بالبینٰت فاستکبروا فی الارض وما کانوا سابقین۔

اور قارون اور فرعون اور ہامان کے پاس موسیٰ ہماری کھلی ہوئی نشانیاں لیکر آیا لیکن انھوں نے زمین پہ تکبر کیا حالانکہ وہ ہم سے زیادہ تیز نہ تھے۔

وان فرعون لعالٍ فی الارض وانه لمن المسرفین۔

اور فرعون زمین پر رفعت و بلندی چاہنے والا تھا اور حد سے زیادہ بڑھ جانے والا تھا۔

قال ربِّ انی دعوتُ قومی لیلاً ونهارًا فلم یزدهم دعائی الا فرارًا وانی کلما دعوتُهم لتغفر لهم جعلوا اصابعهم فی آذانهم واستغشوا ثیابهم واصروا واستکبروا استکبارًا۔

نوح نے کہا اے میرے رب میں نے شب و روز اپنی قوم کو ہدایت کی طرف بلایا لیکن میری پکار سے وہ اور زیادہ دور بھاگنے لگے اور میں نے جب کبھی انھیں مغفرت طلب کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر ڈال لئے اپنے طریقوں پر جمے رہے اور نہایت درجہ شدید تکبر میں مبتلا ہو گئے۔

واقسموا باللہ جهد ایمانهم لئن جاءهم نذیرٌ لیکوننّ اهدیٰ من احدی الامم۔ فلما جاءهم نذیرٌ ما زادهم الا نفورًا استکبارًا فی الارض ومکرَ السیّئ۔

اور انھوں نے نہایت زور و شور سے قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آجائے تو وہ قوموں میں سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہونگے لیکن جب کوئی ڈرانے والا انکے پاس آیا تو انھوں نے اس سے نفرت کا اظہار کیا اور زمین پہ تکبر کیا اور بری تدبیر اختیار کیں۔

ان آیات میں قرآن زوال پذیر اقوام کی دو صفات بیان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کے اندر دنیوی سربلندی اور ظاہری شان و رفعت کا غیر معمولی شوق پایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ استکبار میں مبتلا ہوتی ہیں۔ یعنی ان کی سوسائٹی میں قوی تر افراد ہر طریقے سے کمزور اور غریب افراد پر اپنا تفوق قائم کرکے انھیں اپنے سامنے جھکانا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں صفات اصل

ایک دُوسرے سے قریبی ربط رکھتی ہیں، رفعت و بلندی کی طلب انسانی فطرت کا ایک قدرتی تقاضہ ہے۔ کیونکہ فطرت بشری فطرت الٰہی پر مبنی ہے، اس لئے اس میں علو کی طرف ایک قدرتی رجحان موجود ہے۔ لیکن یہ رجحان جب غلط صورتیں اختیار کرتا ہے، تو اس سے سوسائٹی میں ظلم اور استکبار پیدا ہوتا ہے۔ جب تک قوموں میں اور بالخصوص انکے اعلیٰ طبقوں میں تخلیقی جذبہ موجود رہتا ہے رفعت و بلندی کی یہ طلب وہ آزاد تعمیر و تخلیق کی کوششوں میں ظاہر ہوتی ہے جس فرد میں جتنی زیادہ تخلیقی قوّت اور تعمیری صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی نسبت سے وُہ سوسائٹی میں بلند تر مراتب حاصل کرتا ہے۔ سیاستدان اپنی سیاسی بصیرت سے قوم کو فائدہ پہنچاتے ہیں اس لئے قوم انکو عزّت و رفعت کے بلند مقامات عطا کرتی ہے۔ علماء اور اہلِ قلم اپنے خیالات و افکار اور اپنی علمی خدمات سے قوم میں جوشِ عمل اور ولولۂ حیات پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے سوسائٹی انکو امتیاز و شرف کے اعلیٰ مراتب سے سرفراز کرتی ہے، مالدار اور متموّل اشخاص قومی تعمیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے کے عزّت و شہرت حاصل کرتے ہیں۔ غرضکہ ہر صلاحیت اور ہر ذوق کا انسان اپنی تخلیقی جبلّتوں کو بروئے کار لا کر سوسائٹی کی کوئی ایسی نمایاں خدمت انجام دیتا ہے جس سے قوم کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور لوگ بالکل فطری طریقہ پر بغیر کسی تصنّع، نمائش یا ریاکاری کے اس کی عزّت کرنے لگتے ہیں۔ یہی انسان کی اصلی اور فطری عزّت ہے جو قدرتی صفات کی بنا پر اُسے حاصل ہوتی ہے اور اس کے جذبۂ خدمت اور ولولۂ تخلیق کا قدرتی نتیجہ ہے اس کے لئے نہ اُسے جھوٹے پروپاگنڈے کی ضرورت ہوتی ہے نہ شاعروں کی مدح سرائی اور قصیدہ گوئی کی اور نہ اخبارات کی تعریف و توصیف کی۔ نہ پُرتکلف ساز و سامان اور اسباب زینت و آرائش کی لیکن جب قوموں اور بالخصوص ان کے مالدار اور با اثر طبقات کی تخلیقی صلاحیتیں مُردہ ہو جاتی ہیں اور وہ محض اپنی اعلیٰ اخلاقی خصوصیات یا اجتماعی خدمات کے ذریعہ لوگوں کا احترام حاصل نہیں کر سکتے، تو اُنھیں اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جس عزّت و رفعت کا استحقاق وہ اپنی صفات سے پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں، اُسے غیر فطری اور مصنوعی طریقوں سے حاصل کریں، تاکہ سوسائٹی میں ان کا سابقہ مقام قائم رہے۔ اس نوبت پر وُہ اپنے لباس اپنی رہائش اور اپنی وضع قطع غرضکہ گرد و پیش کی ہر چیز میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتے ہیں، تاکہ ان ظاہری

علامات اور امتیازات کی وجہ سے ان کے احترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب
کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے مالدار اور با اثر طبقوں کی زندگی میں ظاہری آرائش مصنوعی
تکلفات اور امتیازی علامات کی کوئی حد و انتہا نہیں رہتی ہے۔ اس کے برعکس قومیں اپنے
ابتدائے عروج میں طبقاتی امتیازات کی کثرت سے نا آشنا ہوتی ہیں۔ ان کے اندر امارت و غربت
کا ظاہری فرق کم بلکہ تقریباً ناپید ہوتا ہے۔ ان کے بڑے بڑے لوگوں اور ممتاز لیڈروں کی زندگی
میں بھی سادگی کی شان پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ دور تخلیق اور خدمت کا دور ہوتا ہے جس میں
انسان کی تعمیری صفات کی نہ کہ اس کے مال و دولت یا اقتدار و قوت کی قدر کی جاتی ہے اور قوم
کے ممتاز افراد محض اپنی فطری صلاحیتوں اور جذبہ تعمیر و تخلیق کی بنا پر عزت و احترام کے مستحق
قرار دیئے جاتے ہیں۔ اپنا احترام اور وقار قائم رکھنے کے لئے انھیں کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت
نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور ختم ہو جاتا ہے تو قوم کے بااثر طبقے جنہوں نے اپنی اعلیٰ قدروں
اور تعمیری صفات سے سوسائٹی میں ایک امتیازی مقام پیدا کیا تھا، اس کو قائم رکھنے کیلئے مصنوعی
سہارے تلاش کرتے ہیں۔ اپنی سکونت کے لئے بڑے بڑے عالیشان قصر و محل تعمیر کرتے ہیں۔
گھر سے باہر نکلتے ہیں تو کبھی محافظ دستے (Military guards) انکے آگے پیچھے
ہوتے ہیں اور کبھی مصاحبوں، خوشامدیوں اور سرکاری عہدہ داروں کے غول در غول انکی
مشایعت کرتے ہیں۔ انکی سواری نکلتی ہے تو غیر معمولی انتظامات کے ساتھ، شاہانہ تکلفات
اور ٹھاٹھ باٹھ کے بغیر وہ عوام الناس کے سامنے آتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اُن کا لباس نہایت
پر تکلف اور شاہانہ جاہ و حشم کا آئینہ دار ہوتا ہے، انکی وضع قطع نشست و برخاست اور
انداز گفتگو میں تصنع اور غیر فطری نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ سوسائٹی کے بااثر طبقات
طرح طرح کے مصنوعی طریقوں سے عوام الناس کے مقابلہ میں اپنا امتیاز و تفوق برقرار رکھنے
کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ مقام عزت جو انکے اسلاف نے صرف اپنی تعمیری خدمات اور
تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعہ حاصل کیا تھا، انکے ہاتھ سے جانے نہ پائے حالانکہ دراصل وہ
اپنی فطری صلاحیتوں کی کمی اور جذبہ تعمیر و خدمت کے فقدان کے باعث اس مقام کو کھو
چکے ہوتے ہیں اور دراصل یہی احساس کمتری (Inferiority Complex) کہ وہ

اب اس عزت کے اہل نہیں ہیں انھیں ظاہری تکلفات اور زینت و آرائش کے مصنوعی طریقے اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ تاکہ اپنی تخلیقی صفات کی کمی پر وہ ان ظاہری امتیازات و علامات کے پردے ڈال دیں اسی ذہنی کیفیت کو قرآن علو اور استکبار سے تعبیر کرتا ہے اور اسے ایک صفت زوال اور علامت انحطاط قرار دیتا ہے کیونکہ اس ذہنیت اور طرز فکر کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ سوسائٹی کے کم حیثیت افراد اپنی معاشی پستی کے باعث زینت و تفاخر کے ظاہری اسباب سے محروم ہو کر انکے مقابلہ میں اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھنے لگتے ہیں، اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ بھی یہ تمام ظاہری وسائل اور خارجی اسباب زینت و آرائش حاصل کر کے عزت داروں کے زمرہ میں شامل ہو جائیں اس طرح مالدار طبقات اور غریب طبقے دونوں تملیکی جذبات (Acquisitive Instincts) سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ انکی تعمیری صلاحیتیں اور تخلیقی جبلّتیں روز بروز خشک اور افسردہ ہونے لگتی ہیں، اور جذبۂ خدمت یا جوش تعمیر کی جگہ آرائش و زیبائش اور اظہار شان کا جذبہ فروغ پانے لگتا ہے یہاں تک کہ قوم کا ہر فرد دوسرے پر اپنی بڑائی کا سکہ جمانا چاہتا ہے اس طرح برادرانہ تعاون اور احساس اخوت کے بجائے سوسائٹی میں رشک و حسد کے جذبات عام طور سے بھڑک اٹھتے ہیں اور پوری قومی زندگی ایک وسیع دنگل کا منظر پیش کرنے لگتی ہے، جس میں ہر قسم کے بڑے چھوٹے پہلوان ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں لگے رہتے ہیں مالدار طبقے زیادہ سے زیادہ دولت اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی امتیازی علامات اپنے اسباب زینت و آرائش اور اپنی ظاہری شان و شوکت میں اضافہ کریں اور عوام الناس کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ بڑائی جتا سکیں۔ غریب اور متوسط طبقات مال و دولت کی ہوس میں اس لئے گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اب سوسائٹی میں عزت و احترام پیدا کرنے اور ذلت و حقارت سے محفوظ رکھنے کا اور کوئی طریقہ باقی نہیں رہتا۔ بجز اسکے کہ آدمی مال و دولت کے اعتبار سے ممتاز اور حکمران طبقہ کی سرپرستی سے آبرو دار ہو۔ کیونکہ ایسے زمانہ میں تعمیری صفات اور تخلیقی صلاحیتوں کی کوئی قدر نہیں رہتی ہے جنکی بخشش اور تقسیم میں قدرت اتنی فیاض ہے، کہ وہ مالدار اور حکمران طبقات کے ساتھ کوئی مخصوص رعایت نہیں برتتی ہے۔ غرضکہ قوموں کے دور زوال و انحطاط میں صرف روپیہ پیسہ مال و دولت اور مصنوعی اعزازات و مناصب افراد انسانی کے شرف و عزت کا معیار قرار پاتے ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں

تعمیری کاموں اور تخلیقی سرگرمیوں پر افسردگی چھائی رہتی ہے اور لوگوں پر مادیت اور دنیا پرستی کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کو شب و روز صرف یہی فکر رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنی دولت میں اضافہ کرسکے یا عہدہ میں ترقی کرکے سوسائٹی میں زیادہ سے زیادہ شرف و امتیاز حاصل کرے۔ جب انسان کا مرتبہ اور مقام اس طرح مادی اور معاشی پیمانوں سے ناپا جانے لگتا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب اور متوسط طبقات اور زیادہ معاشی مصائب اور مالی مشکلات میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں کیونکہ اکتساب زر اور حصولِ دولت کی اس دوڑ میں اسی طبقہ کے افراد کو کامیابی کا موقعہ ملتا ہے، جس کے ہاتھ میں قوم کا سیاسی اقتدار ہو۔ پھر یہ طبقہ چونکہ اپنے اسبابِ عیش، اظہارِ تفوق اور سامانِ زینت کے لئے زیادہ سے زیادہ مال و دولت خود حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لئے قومی دولت کا بہت کم حصّہ متوسط اور غریب طبقات کے ہاتھ آسکتا ہے۔ اگر تحصیلی جذبات (Acquisitive desires) کے ساتھ ساتھ کچھ تعمیری صفات اور تخلیقی جذبات بھی موجود ہوں، تو قوم کی مجموعی دولت میں اضافہ ہوسکتا ہے اور اس اضافہ سے متوسط اور غریب طبقات کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن چونکہ تخلیقی سرگرمیاں اور تعمیری کوششیں طلبِ زر اور حصولِ اقتدار کی جدوجہد میں سرد پڑ جاتی ہیں، اس لئے قومی دولت میں اضافہ ہونے کی بجائے اور زیادہ کمی ہونے لگتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت مند طبقوں کے اسبابِ عیش اور سامانِ آرائش پر قومی دولت کا جتنا زیادہ حصّہ صرف ہوتا جاتا ہے اسی نسبت سے متوسط اور غریب آدمیوں کی معاشی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح استکبار اور علو جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے ایک ایسی قوم کی صفات ہیں جس میں تعمیر و تخلیق کے بجائے مال و دولت کو معیارِ عزّت قرار دے دیا گیا ہو، اور قوم کے مالدار اور با اثر طبقات اپنی مصنوعی شان و شوکت اور امتیازی علامات کو برقرار رکھنے یا ان میں اضافہ کرنے کیلئے قومی دولت کا زیادہ سے زیادہ حصّہ صرف کرکے متوسط اور غریب طبقات کا خون چوستے ہوں، ایسی سوسائٹی میں بجائے اسکے، کہ لوگ اپنے جذبۂ تعمیر اور جوشِ تخلیق کے ذریعہ قوم کے خزانہ کو نئی نئی ایجادات و اختراعات اور فتوحاتِ ذہنی و مادّی سے بھرپور کریں، اس میں سے ہر شخص ہاتھ ڈال کر اتنا کچھ نکال لیتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں خزانہ خالی نظر آنے لگتا ہے۔

استکبار یعنی مصنوعی امتیاز و تفوق کی سعی و طلب سوسائٹی میں ایسے آداب و رسوم اور ظاہری طریقے پیدا کرتی ہے۔ جو کم حیثیت افرادِ معاشرہ کی تذلیل و تحقیر کا موجب بن جاتے ہیں اس لئے ایسا معاشرہ جس پر استکبار کا رنگ غالب ہو رفتہ رفتہ خوددار انسانوں کے وجود سے خالی ہو جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ اس جھوٹی شان اور مصنوعی تفریق کو خاطر میں نہیں لاتے اور محض قلّتِ مال یا دنیوی مناصب اور عہدوں سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو کمتر تصور کرنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں بلکہ انسانوں کو ان کے جذبۂ تعمیر و تخلیق کے پیمانہ سے جانچتے ہیں وہ متکبرین کی ناراضگی اور جوشِ انتقام کا شکار ہو کر معاشی ترقی اور دنیوی اعزاز سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ دنیوی اعزازات و مناصب ان لوگوں کو ملتے ہیں جو اپنی ذاتی خودداری کو قربان کر کے جھوٹی خوشامد اور تعریف و توصیف کے عادی ہوں۔

- -

. . . . اس طرح ظاہر پسندی، ریاکاری، منافقت، بیجا خوشامد غرضکہ جھوٹ کی تمام صورتیں سوسائٹی میں فروغ پانے لگتی ہیں۔ صداقت پسند اور خوددار طبائع جو ان باتوں کو پسند نہیں کرتے وہ روز بروز معاشی حیثیت سے تنگ حال اور سیاسی اعتبار سے گمنام اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ سچائی اور حق پسندی اپنی تمام شکلوں میں جھوٹ اور منافقت کے اس طوفان میں بہ جاتی ہے۔ دین و مذہب کو بھی اخلاق اور نیک کرداری کے اصول پر جانچنے کے بجائے لوگ ظاہری رسوم و شعائر کے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے دینی اور مذہبی حیثیت سے بھی انہیں لوگوں کا زور ہوتا ہے جو اصلی اخلاق سے بالکل عاری لیکن ظاہری علاماتِ دینداری سے آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں۔ اس طرح دولت و اقتدار کی پرستش انسان کو صداقت پسندی سے ہٹا کر اس میں سے یہ قابلیت فنا کر دیتی ہے کہ وہ حقیقت کو اوہام و خرافات اور ظاہری نمائش کی چیزوں سے متمیز کر سکے، اور زندگی کی حقیقی اقدار یعنی تعمیر و تخلیق اور خدمتِ خلق کو اس کا جائز مقام عطا کرے۔ اسی حقیقت کو حضرت موسیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ — اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو

زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ — دنیوی زندگی کے مال و متاع اور اس کی ظاہری زینتوں

الدُنیا لیضلّوا عن سبیلک ۔ سے مالا مال کر دیا ہے تاکہ وہ تیری راہ سے ہٹ جائیں یعنی فرعون اور اس کے سرداروں کو مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی جو فراوانی عطا کی گئی ہے وہ انھیں راہِ حق سے اور زیادہ دُور ہٹا دینے کی موجب بن گئی ہے، اُنہوں نے اخلاقی اقدار و معیارات کا پورا نظام اُلٹ کر رکھ دیا ہے، اجتماعی زندگی کے لئے جو چیزیں واقعی اہمیت رکھتی ہیں یعنی انسان کا جذبۂ خدمت اور اسکی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں انکے بجائے یہ لوگ مال و دولت اور ظاہری اسباب نمائش کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں اور انھیں چیزوں کے ہونے نہ ہونے پر انسان کے معاشرتی مرتبہ اور اس کی عزت اور قدر و منزلت کا دارومدار رکھتے ہیں۔ اس طرح مال و دولت اور اسبابِ عیش کی پرستش نے انکی اجتماعی بصیرت زائل کر کے انھیں سچائی سے بیگانہ بنا دیا ہے ۔

جب سوسائٹی پر زرپرستی اور ہوسِ اقتدار کی یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسکے افراد مادّی اقدارِ حیات کے پرستار بن جاتے ہیں تو یہ بات اُنکی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی ایسا شخص جس کا سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق نہ ہو، اور جو مال و دولت کے اعتبار سے کوئی خاص فضیلت نہ رکھتا ہو، حق اور صداقت کا مبلّغ کیسے بن سکتا ہے یا قوم اس کی لیڈرشپ کیسے قبول کر سکتی ہے۔ مادّی طاقت اور معاشی قوّت کی پرستش کرتے کرتے ان کا طرزِ فکر اتنا غلط ہو جاتا ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جو بات ان سے کہی جارہی ہے، وہ فی نفسہٖ صحیح ہے یا غلط، بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ بات کون کہہ رہا ہے۔ کہنے والے کا تعلق کس طبقہ سے ہے؟ آیا وہ دُنیوی حیثیت سے عزّت دار اور معاشی حیثیت سے مالدار ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے دُنیوی عزّت و وجاہت سے محروم پاتے ہیں تو اسکی بات کو حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ حق کو اشخاص اور طبقات کے ذریعہ پرکھنا چاہتے ہیں۔ قوم نوح اور بنی اسرائیل کی اسی ذہنیت کو بے نقاب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :—

فقال الملاءُ الذین کفروا من قومہٖ ما نرٰئک اِلّا بشراً مثلنا وما نرٰئک اتبعک اِلّا الذین ھم اراذلنا بادی الرأیِ وما نریٰ علیکم من فضلٍ

قوم نوح کے سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا تھا نوح سے کہا کہ ہم تجھے ایک معمولی انسان ہی پاتے ہیں اور جو لوگ تیرے پیرو ہیں وہ تو انہیں افراد پر مشتمل ہیں جن کو ہم رذیل سمجھتے ہیں اور ہم تم لوگوں میں کوئی فضیلت

بل نظنّکم کاذبین ۔ — نہیں دیکھتے بلکہ نہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں ۔

وقال لھم نبیّھم ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا قالوا انّی یکون لہ الملک علینا ونحن احقّ بالملک منہ ولم یؤت سعۃً من المال ۔

بنی اسرائیل کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے انھوں نے کہا کہ اسکو حکومت کس طرح مل سکتی ہے اس سے زیادہ حکومت کے حقدار تو ہم ہیں کیونکہ اسے مال و دولت کی فراوانی حاصل نہیں ہے ۔

پہلی آیت میں قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت نوح کی قوم نے ان کا انکار اسلئے کیا کہ انکے ماننے والے غریب طبقہ کے افراد تھے اور دنیوی حیثیت سے ذلیل و خوار سمجھے جاتے تھے، جب قوم نوح کے سرداروں نے آپ سے یہ کہا کہ ہم تمہارے اندر کوئی فضیلت نہیں پاتے "تو فضیلت سے انکی مراد یہ تھی، کہ نہ تو مال و دولت کے اعتبار سے تم ممتاز ہو اور نہ منصب یا عہدہ کے لحاظ سے تم کو کوئی تفوق حاصل ہے۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل اس امر پر اظہار تعجب کرتے ہیں کہ طالوت کو ان کا لیڈر بنانے کی تجویز کی جارہی ہے حالانکہ معاشی حیثیت سے وہ کسی خاص مرتبہ کا حامل نہیں ہے، یہ دونوں طرز فکر قوم نوح اور بنی اسرائیل کی انحطاط پذیر ذہنیت کے آئینہ دار ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں قوموں پر مادی اقدار کی پرستش کتنی بری طرح چھائی ہوئی تھی اور کس طرح وہ انسان کی تخلیقی جبلتوں تعمیری صلاحیتوں اور جذبہ خدمت کے بجائے انکی تملیکی قوتوں (Acquisitive faculties) کو معیار عزت سمجھتے تھے ۔

جب تعمیر و تخلیق کی ٹھوس حقیقت کے بجائے دولت ملکیت، عہدے اور سیاسی مناصب سوسائٹی میں غیر معمولی اہمیت اور مبالغہ آمیز وزن حاصل کر لیتے ہیں تو ہر شعبہ حیات میں نمائش، ظاہرداری اور بے روح ضابطہ پرستی کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ حکومت کے دفاتر سے لیکر کالجوں، مدرسوں، مذہبی اداروں یہاں تک کہ گھریلو زندگی میں بھی ظاہر پرستی کی علامات اتنا نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ سرکاری دفاتر کی کثرت، انکی عمارتوں کی شان و وسعت یا عہدیداران اور کارکنان نظم و نسق کی تعداد کو دیکھ کر بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کی مشنری پوری قوت اور تیزی سے سرگرم کار ہے لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہوتی ہے۔ ظاہری قواعد و ضوابط کی جکڑ بندیوں اور نمائشی کاموں کے سوا اصل تعمیری کام سے کسی کو دلچسپی نہیں رہتی ۔

قواعد و ضوابط اسلئے نہیں بنائے جاتے ہیں تاکہ اجرائے کار میں سہولت ہو اور حاجتمندوں کی ضروریات و شکایات پر جلد توجہ کی جاسکے۔ اس کے بجائے قوانین اور قاعدوں کی یہی کثرت کارروائیوں کے التوا یا تاخیر کا سبب بن جاتی ہے، پھر اکثر اوقات انہیں قواعد و ضابطوں کی آڑ لیکر قانون کے اصل منشاء و مقصد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے، اوقات کی سخت پابندی سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ کارکنانِ حکومت ہر وقت اپنا کام انجام دیتے ہیں لیکن جب ضرورتمند افراد کو ان سے عملاً سابقہ پڑتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ظاہری نمائش ہے، حقیقت میں کارکنانِ حکومت کام کرنے کے بجائے اپنا زیادہ وقت فضولیات اور تفریحی مشاغل میں ضائع کردیتے ہیں۔ مدارس اور کالجوں میں بھی تعلیم کا ظاہری نظام بڑا دلفریب اور مرعوب کن ہوتا ہے۔ رجسٹروں کی کثرت، اوقات کی پابندی تصاویر اور نقشہ جات کے استعمال طلبا کی نصابی کتب اور مضامین کی تعداد امتحانوں کی چہل پہل، اساتذہ کی ڈگریوں اور تعلیمی کھیلوں اور ڈراموں سے دیکھنے والے پر فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کا معیار بہت بلند اور اساتذہ کی کارکردگی بڑی عمدہ ہے لیکن اگر ان ظاہری پردوں کو اٹھا کر اندر دیکھا جائے تو حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے تعلیم کی اصل روح یعنی اساتذہ اور معلّمین کا جذبہ خدمت اور طلباء کی اکتسابی اہلیت دونوں کا معیار گرجاتا ہے معلّموں اور متعلّموں کو رسمی خانہ پری اور حاضر باشی کے سوا تعلیم و تعلّم کے اصل کام سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ یہی حال ہسپتالوں اور کارخانوں کا ہوتا ہے کہ ہر جگہ کام کم اور نمائش زیادہ ہوجاتی ہے۔۔ دواخانوں میں ساز و سامان کی کثرت، ڈاکٹروں اور نرسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور دیگر ظاہری سہولتوں کو دیکھ کر بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کا نظامِ صحت بڑے حسن و خوبی سے چل رہا ہے لیکن مریضوں کو جو تلخ تجربات پیش آتے ہیں ان سے اس کی تکذیب ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹروں نرسوں اور دوسرے اسپتالی عملہ میں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کا جذبہ فنا ہوچکا ہے اور یہ لوگ روپیہ پیسہ کے لالچ یا ترقی کی خواہش اور توقعات کو مدِّنظر رکھ کر صرف با اثر اشخاص اور متموّل افراد کے علاج و معالجہ پر توجہ کرتے ہیں اور متوسط یا غریب طبقہ کے مریضوں کے ساتھ دل کھول کر بے اعتنائی برتتے ہیں حتّٰی کہ بعض صورتوں میں اس عدم توجہ اور بے التفاتی کے باعث غریب طبقہ کے مریض

نقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

گھریلو زندگی میں یہ ظاہر پرستی لباس کی تراش و خراش۔ فرنیچر کی آراستگی اور رفقاؤں کے تنوع میں ظاہر ہوتی ہے، اس کے علاوہ بیہودہ رسموں اور غیر ضروری روایات کی پابندی پر بہت زیادہ توجہ کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے لوگ تعمیر و تخلیق کے کاموں میں دل لگانے کے بجائے اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں ان کے لباس میں تو کوئی خامی نہیں رہ گئی ہے، انکا مکان فرنیچر اور ساز و سامان سے مکمل طور پر آراستہ ہے یا نہیں۔ مہمانداری کے طریقوں میں کوئی نقص تو نہیں ہے۔ بزرگوں، دوستوں اور ملاقاتیوں کے ظاہری احترام اور خاطرداری میں تو کوئی خلا باقی نہیں رہ گیا ہے۔ شادی بیاہ اور موت و پیدائش کے وقت ضروری رسوم و رواج کی پابندی کی جاتی ہے یا نہیں۔ غرضکہ یہی تمام ظاہری امور مردوں اور عورتوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں، اور انھیں بعض وقت اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ان کی وجہ سے خاندانی تعلقات بگڑ جاتے ہیں، اور طرح طرح کے جھگڑے اور فسادات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

مذہبی زندگی میں ظاہر پرستی کا یہ شوق تقویٰ اور تورع کی اُن شکلوں میں نمودار ہوتا ہے جن کے پس پشت نہ سچی خلوص اور نہ مذہبی اخلاص کی کوئی طاقت نہیں ہوتی ——— لوگوں کی مذہبیت اس نقطۂ نظر سے جانچی جاتی ہے۔ کہ ان کے چہرہ پر داڑھی اور ٹانگوں میں اونچا پاجامہ ہے یا نہیں، بقرعید کی قربانی کرتے ہیں یا نہیں۔ بزرگوں، پیروں اور اولیائے کرام سے ان کی عقیدت کا کیا حال ہے۔ فاتحہ اور درود پر عقیدہ رکھتے ہیں یا وہابیت کی طرف مائل ہیں نماز، روزہ میں سستی یا تاخیر تو نہیں کرتے ہیں۔ اگر مالدار آدمی ہو، تو اس کے متعلق سوال کیا جاتا ہے، کہ اس نے حج کتنی مرتبہ کیا ہے۔ میلاد کی کتنی محفلیں منعقد کر چکے ہے اور رمضان کے مہینہ میں اس کے گھر سے افطاری مسجد بھیجی جاتی ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس سچی خداترسی، قانون جزا و سزا کا خوف، معاملات کی درستگی۔ فرض شناسی، وقت کی قدر و قیمت کا احساس فضولیات سے احتراز۔ خدمتِ خلق کا جذبہ، تعمیر و تخلیق کا ولولہ، کسی اچھے مقصد کے لئے مالی ایثار کرنا اور بڑے بڑے اعزازات و مناصب اور عہدوں کو ٹھکرا دینا۔ زندگی کی لذتوں اور

مسرتوں کو اعلیٰ مقاصد پر قربان کر دینا یہ تمام چیزیں جو مذہب کی روح اور دین کا نچوڑ ہیں ظاہر پرست دینداروں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں حکومت کے نظم و نسق کی طرح مذہبی قواعد و ضوابط کی کثرت میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر ضروری اور غیر فطری پابندیوں سے تنگ آ کر ذہین لوگ مذہب سے باغی ہو جاتے ہیں، حالانکہ قواعد و ضوابط کی اس ظاہری حرمت کے باوجود انھیں قاعدوں اور ضابطوں کی مدد سے دوسرے اہم تر اور زیادہ بنیادی قوانین مذہب کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔

تعمیر و تخلیق کا جوش سرد پڑ جانے اور تملیکی جذبات (Acquisitive desires) کے غالب آ جانے سے لوگوں کے اندر مال و دولت کے متعلق جو نقطہ نظر پیدا ہو جاتا ہے اس کا حال قرآن کریم نے قوم مدین کے واقعہ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: —

قالو یشعیب اصلوتک تامرک ان	انھوں نے کہا اے شعیب کیا تیری عبادت کے طریقہ میں یہ
نترک ما یعبد اباونا وان نفعل	ضروری ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے آباؤ
فی اموالنا مانشاؤ۔	اجداد پوجتے تھے اور ہم اپنے مال و دولت کے استعمال میں آزاد نہ ہوں

اس آیت میں قوم شعیب کی ذہنیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح اس قوم کے مالدار افراد اپنی کمائی ہوئی دولت میں کسی قسم کے معاشرتی اور اجتماعی حقوق تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے اور چاہتے تھے، کہ اپنی جائداد، ملکیت اور روپیہ پیسہ کے استعمال میں بالکل آزاد اور غیر پابند رہیں جس طرح چاہیں، انھیں خرچ کریں، اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو کہ ہم نے کیا خرچ کیا اور کتنا بیجا صرف کیا، یا روپیہ پیسہ کو صحیح مصرف لائے۔ اپنی کمائی کو عیش و لذت کے سامان اور زینت و تفاخر کے اسباب پر لٹا دیا، یا سوسائٹی کے غریب اور پریشان حال افراد کے حقوق اور قومی تعمیر کی ضروریات کا بھی لحاظ کیا۔ مال و دولت اور تمام ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے بارے میں زوال پذیر اقوام کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ ان کے استعمال میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کے تمام قیود و حدود غیر فطری اور مصنوعی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے جسم، اپنی عقل اور اپنے مال و دولت کو جس مقصد پر چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔ جب انھیں بتایا جاتا ہے کہ روپیہ پیسہ ہو، یا انسان کی ذہنی، جسمانی اور عقلی ثروت ان کا مصرف صحیح ہونا چاہیئے۔ غلط مقاصد، فضول کاموں اور شخصی یا خاندانی اغراض کی خاطر مالی، معاشی اور

ذہنی قوتوں کو ضائع کر دینا انسانیت کے حقوق کو پامال کرنا ہے، تو وہ اس قسم کی پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا استدلال بالعموم یہ ہوتا ہے، کہ یہ سب چیزیں ہم نے اپنی ذاتی جدوجہد اور محنت سے پیدا کی ہیں اِس لئے ہم آزاد ہیں کہ جس مقصد کے لئے چاہیں انھیں صرف کریں اور جس طرح چاہیں ان کا استعمال کریں۔ یہ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ انسان اپنی محنت اور جدوجہد سے ایک دانہ بھی اُگا نہیں سکتا، اگر فطرت نے پہلے سے اسکے اندر کچھ صلاحیتیں اور بلند تمنائیں ودیعت نہ کر دی ہوں، اور پھر خارج میں اشیاء و وسائل کا سلسلہ نہ پیدا کیا ہو۔ انسان کی مادی دولت ہو، یا ذہنی قابلیت، ان میں سے کوئی چیز بھی وہ از خود پیدا نہیں کرتا، کارساز فطرت اس کے اندر اکتساب اور جدوجہد کی جو صلاحیت رکھ دیتا ہے، اور جن مخصوص ملکات سے اسے مالامال کرتا ہے انھیں کی بنا پر وہ دنیوی ترقی کا پہلا قدم اُٹھا سکتا ہے اس لئے خارج میں جو وسائل اور قوتیں ہم حاصل کرتے ہیں، خواہ وہ ہماری علمی فضیلت ہو، فنی مہارت ہو، یا مال و دولت اور سیاسی طاقت ہو، وہ سب قدرت کے عطیات ہیں، جو معاشرتی اور اجتماعی اغراض کی خدمت کے لئے وہ ہمارے سپرد کرتی ہے، نہ کہ ہماری ذاتی بڑائی، شخصی عیش و راحت یا خاندانی عظمت و رفعت کے لئے جو شخص اجتماعی اغراض اور معاشرتی مفاد کو ملحوظ رکھے بغیر، یا ان مقاصد کے بالکل خلاف اپنی ذہنی، فنی، معاشی، یا دیگر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ ہم نے ذاتی جدوجہد سے مال و دولت سیاسی طاقت یا علمی فضیلت حاصل کی ہے اس لئے اب ہم آزاد ہیں کہ دوسرے انسانوں کے حقوق اور معاشرتی اغراض سے بے نیاز ہو کر انکو جس طرح چاہیں استعمال کریں، وہ منشائے قدرت کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اپنی فطرت صحیحہ سے باغی ہے جبتک قوموں کا تعمیری جوش اور تخلیقی ولولہ بیدار رہتا ہے انکے افراد اپنے مال و دولت اپنے علم و فضل اور اپنی سیاسی قابلیت کو ذاتی ملکیت نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ انھیں مذہبی، معاشرتی اور اجتماعی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں چنانچہ ہر ترقی پذیر قوم کی یہ صفت ہوتی ہے کہ اس کے مالدار لوگ، اسکے اہل علم اور سیاسی لیڈر اپنے مال و دولت، علم و فضل اور سیاسی بصیرت کا بڑا حصہ صرف ذاتی بڑائی اور ترقی یا خاندانی عظمت و ناموری کے لئے نہیں بلکہ قومی مقاصد کی خدمت کیلئے صرف کرتے ہیں لیکن جب قوم پر تعمیری اور تخلیقی احساسات کے بجائے تملیکی جذبات غالب آجاتے ہیں تو

لوگ ان تمام وسائل کو صرف اپنی ذات یا اپنے خاندان کے مفاد کی خاطر استعمال کرتے ہیں اور تعمیری ضروریات یا کمزور افراد معاشرہ کے حقوق کا لحاظ کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اسکی مثال ہمیں موجودہ سرمایہ داری کی تاریخ میں بھی ملتی ہے۔ جب تک یورپ اور امریکہ کی سرمایہ دار قومیں ترقی پذیر تھیں! اور اُن میں تخلیقی جوش موجود تھا، ان کے سرمایہ دار اور متموّل افراد اپنی ذاتی دولت قومی اور اجتماعی اغراض کے لئے بے دریغ صرف کرتے تھے کہیں ان کے روپیہ پیسہ سے سائنٹفک ادارے قائم ہوتے تھے، جن میں سائنسدان اور ماہرین فن تحقیقات و تجربات کر کے نئی نئی ایجادات و اختراعات کے انبار لگا دیتے تھے کہیں تاریخی، تمدنی اور ثقافتی انجمنیں قائم کی جاتی تھیں، جن میں اہل علم معاشی اور تاریخی مسائل پر غور و خوض کرتے تھے کہیں صنعتی توسیع کے لئے بڑے بڑے عظیم الشان کارخانے بنائے جاتے، کہیں خیراتی اسپتالوں اور صحت گاہوں کی تعمیر کے لئے سرمایہ دار اپنا روپیہ وقف کرتے کہیں غیر سرکاری مدارس کھولے جاتے، تاکہ فن تعلیم میں نئے نئے تجربات عمل میں آئیں، غرضکہ ان ملکوں کے سرمایہ دار طبقہ میں تعمیر و تخلیق کا ایک بے پناہ جذبہ تھا، جس کی وجہ سے وہ قومی اور اجتماعی کاموں میں روپیہ لگانے کو ضروری اور مفید سمجھتے تھے اور ان کے دل میں یہ غرور و تکبر کبھی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ یہ روپیہ پیسہ ہماری ذاتی ملکیت ہے۔ لہٰذا ہم یہ پابندی قبول نہیں کر سکتے ہیں، کہ اسے اجتماعی اغراض یا غریبوں کی خدمت کے کام میں لگائیں، بلکہ ہم اسے ذاتی عیش و راحت کے سامان اور اظہار زینت و شان کے وسائل پر صرف کر دینے میں بالکل حق بجانب ہیں لیکن انھیں قوموں پر جب سے زوال آنا شروع ہوا، ان کے سرمایہ داروں، عالموں اور فنی ماہرین غرضکہ ہر صاحب فضیلت کا نقطۂ نظر بدل گیا، چنانچہ اب ایسے سرمایہ داروں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے جن کا روپیہ پیسہ قومی کاموں یا غریبوں کے مفاد پر صرف ہوتا ہو۔ یہ لوگ اپنے مال و دولت کو یا تو مزید آمدنی کے حصول کی خاطر صرف کرتے ہیں، یا اپنی آرام و راحت اور عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کے لئے اور اگر کسی وجہ سے انھیں یہ دونوں صورتیں ناپسند ہوں، تو اپنا روپیہ بینکوں میں بیکار جمع رکھتے ہیں، لیکن انھیں یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی دولت قوم و ملک کے غریب و نادار افراد کے کام آئے اسی طرح ان قوموں کے علما، اور فضلا، فنی ماہرین اور سیاستدان اپنی ذاتی شہرت اور نام و نمود، اپنی شخصی وجاہت یا خاندانی بڑائی کے پیچھے سرگرداں ہیں اور اپنی اعلیٰ ترین ذہنی اور اخلاقی صفات

کو شخصی اور خاندانی اغراض کی ترقی کے لئے استعمال کرتے ہیں نہ علماء کا علم قوم کے کام آتا ہے، نہ فنی ماہرین کی مہارت اور نہ لیڈروں کی سیاسی بصیرت جب تک اس سے انہیں ذاتی فائدہ کی توقع نہ ہو منفعت پرستی کا یہ جذبہ اور تملیکی جبلتوں کا یہ قہرمانہ غلبہ تعمیر اور تخلیق کی تمام راہیں مسدود کر رہا ہے جس قوم پر ایسی تنگ نظرانہ منفعت پرستی اور ہوسِ تملیک غالب آجائے اس میں تعمیر و تخلیق اور معاشرتی سود و بہبود کے کام یا تو رکے پڑے رہتے ہیں، یا بالکل بند ہو جاتے ہیں، کیونکہ لوگوں کا نقطۂ نظر مال و دولت اور ذہنی صلاحیتوں کے متعلق وہی ہو جاتا ہے جس کا قرآن نے قوم مدین کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے یعنی یہ مال و دولت اور یہ ذہنی صلاحیتیں ہماری ذاتی جدوجہد کا نتیجہ ہیں اس لئے دوسروں کو ان کے فوائد سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اور ہم اس امر میں بالکل حق بجانب ہیں، کہ ان تمام چیزوں کو صرف اپنی ذاتی آرام و لذت شخصی اغراض اور خاندانی مفاد کیلئے صرف کریں۔ مذہب کے داعیوں اور اخلاق کے مبلغوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہم پر اخلاقی معاشرتی یا مذہبی اصولوں کے نام سے کوئی پابندی عائد کریں۔ قرآن کہتا ہے، کہ یہی آزادروی اور انانیت یہی منفعت پرستی، اور تخلیقی افلاس قوموں کو زوال و نکبت کی طرف لیجاتا ہے۔

پھر اسی جذبۂ تعمیر اور جوشِ تخلیق کی کمی کے باعث زوال پذیر طبقات و اقوام میں کورانہ تقلید کا مرض پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ نہ تو کسی نئی بات کو سُن سکتے ہیں اور نہ اس پر غور کر سکتے ہیں۔ مادی زندگی کی دلچسپیوں میں انہماک کے سبب سے ان کا ذہنی افق اتنا تاریک اور ان کی سطحِ عقل اتنی پست ہو جاتی ہے، کہ خود تو کسی نئے طریقے کی دریافت کرنا، یا نئی بات کا انکشاف کرنا درکنار اگر کوئی تخلیقی ذہن یا تعمیری دماغ ان کے سامنے کوئی اچھوتا تخیل پیش کرے تو خواہ اس میں کتنی ہی زبردست سچائی ہو، وہ اسے ایک بدعت سمجھ کر نہ صرف رد کر دیتے ہیں بلکہ پورے زور و شور سے اس کی مخالفت اور تردید کرتے ہیں، اسی انحطاطی ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن قوم فرعون کے بیان کے سلسلہ میں کہتا ہے:۔

قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ اباءنا وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمومنین۔

اُنہوں نے کہا کیا تو اسلئے آیا ہے کہ ہمیں اس راستہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا تھا اور تم دونوں کے لئے زمین میں بڑائی ہو، ہم ہرگز ایمان والے نہیں ہیں۔

ایک اور جگہ اسی طرزِ فکر کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:۔

واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول قالو حسبنا ما وجدنا علیہ اباؤنا۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے اسکی طرف اور رسول اللہ کیطرف آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے باپ دادا نے ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے۔

ان آیات کے علاوہ قرآن کی اور بے شمار آیات میں بھی تباہ ہونے والی قوموں کی تقلیدی روش کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال پذیر قوموں میں اتنی ذہنی اپج باقی نہیں رہتی کہ وہ زندگی کا کوئی نیا راستہ اختیار کر سکیں یا اپنے طور طریقوں میں کوئی مفید تبدیلی پیدا کر سکیں بلکہ جو بنا بنایا راستہ یا لگے بندھے طریقے انکو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملتے ہیں انہیں پر آنکھیں بند کر کے چلتی رہتی ہیں۔ قرآن نے تو صرف آبا و اجداد کی تقلید کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں تقلید کا مرض پیدا ہو جاتا ہے تو وہ صرف آبا و اجداد کے طریقوں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ ایک سے زائد صورتیں اختیار کرتا ہے مثلاً ہمارے مغرب زدہ طبقہ میں انگریز بننے کا جو شوق ہے وہ بنیادی حقیقت کے اعتبار سے ان لوگوں کی روش سے مختلف نہیں جو اسلاف کے طور طریقوں کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں ذہنی اور تعمیری اپج بالکل فنا ہو گئی ہے اسلئے ایک آنکھیں بند کر کے آبا و اجداد کے طریقوں پر عمل کرتا ہے اور دوسرا اس طرزِ فکر اور طرزِ حیات کی تقلید میں گرفتار ہے جو اسے انگریز آقاؤں سے ملا ہے۔ دونوں کے اندر اتنی صداقتِ فکر اور قوتِ تخیل موجود نہیں کہ وہ ان بنے بنائے طریقوں میں سے کسی اصول کے مطابق اچھی باتیں اخذ کر کے بری باتیں ترک کر دے۔ کیونکہ اس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی انتخابی نگاہ اور تنقیدی فکر درکار ہے جو کھرے کھوٹے اور اچھے برے میں تمیز کر سکے۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا نے جس معاشرتی انقلاب کی بنیاد ڈالی اس میں بھی یہی تقلیدی جذبہ کارفرما تھا، ترکی کا کمالی انقلاب کوئی تعمیری یا تخلیقی انقلاب نہ تھا، بلکہ ایک تقلیدی انقلاب تھا۔ کمالی پارٹی کے ارکان اور انکے دشمن یعنی پرانے طرز کے علماء ذہنی اعتبار سے ایک ہی سطح کے لوگ تھے، فرق صرف یہ تھا، کہ مصطفےٰ کمال اور اس کی پارٹی یورپ کی تقلید کرنا چاہتی تھی۔ اور ملاؤں کا طبقہ اپنے اسلاف کے پرانے طریقوں پہ چلنا چاہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ مصطفےٰ کمال کی حکومت نے اسلام کے

بنیادی اصولوں سے نئے حالات کے مطابق ایک جدید اسلامی نظامِ قانون مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، بلکہ فرانس اور سویٹزرلینڈ کے قوانین کو من و عن لیکر ترکی میں رائج کر دیا۔ اسی تقلیدی روش کے نتیجہ میں ترکوں کو قوم پرستانہ طرزِ فکر کی تعلیم دے کر انھیں اسلام کی عالمگیر برادری سے توڑ لیا گیا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد بھی ترکی کی بین الاقوامی پوزیشن میں کوئی خاص فرق نہ ہونے اور اس ملک پر مغربی ممالک کی بالادستی قائم رہنے کا سبب بھی یہی ہے کہ ترکوں نے اجتہاد کے بجائے تقلید کی روش اختیار کی۔

زوال پذیر قوموں کے اس جذبۂ تقلید کا بنیادی سبب اگر تلاش کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ذہنی انحطاط دراصل مادّی اقدار کی پرستش سے پیدا ہوتا ہے۔ جو قومیں زندگی کی ادنیٰ لذّات، عیش و راحت، اسبابِ زینت اور سامانِ آرائش پر جان دیتی ہیں اور انہیں چیزوں کے حصول کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیتی ہیں، ان کے اندر جزوی امور کو سمجھنے کی صلاحیت تو ضرور ترقی کر جاتی ہے، لیکن عمومی قوانین اور مجرّد تصورات کے فہم و ادراک کی قابلیّت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ مادّی زندگی کی آرائش و زیبائش اور کام و دہن کی لذّت حاصل کرنے میں انہیں اپنی عقلِ جزوی کو قدم قدم پر استعمال کرنا پڑتا ہے لیکن ان ادنیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے عقلِ کلّی کی امداد و وساطت ضروری نہیں ہوتی۔ حالانکہ انسانی زندگی کے بنیادی قوانین خواہ ان کا تعلّق سائنس سے ہو، تاریخ سے ہو، یا مذہب و اخلاق سے صرف اس عقل کی مدد سے جانے بوجھے جا سکتے ہیں۔ جو جزویات کے تجربہ سے کلّیات تک پہنچ سکے اور تفصیلی مشاہدات سے عمومی قوانین مستنبط کر سکے، جو عقل صرف جزویات و تفصیلات میں الجھ کر رہ جائے وہ حیات کے بنیادی قوانین اور سائنس کے اصول و کلّیات تک کیسے رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ کفّار اور مشرکین کو عقیدہ توحید سے جو انکار تھا، اس کی حقیقی وجہ یہ تھی، کہ یہ لوگ مادّی زندگی کی ادنیٰ دلچسپیوں میں اتنے منہمک اور وارفتہ تھے کہ ان کا ذہن ٹھوس مادّی حقائق کے علاوہ اعلیٰ تر مجرّد تصوّرات اور عمومی قوانین کا ادراک کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسلئے یہ لوگ عقیدۂ توحید کو سمجھنے سے قاصر تھے جو ہمیں اس امر کی تعلیم دیتا ہے، کہ کائنات کے مختلف شعبوں میں جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں

خواہ ان کی ظاہری شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں، اصل میں ایک واحد قانون کے منبع سے صادر ہوتے ہیں۔ یہی صفت ہر اُس قوم میں پیدا ہو جاتی ہے، خواہ وُہ توحید کی نمائشی دعویدار ہی کیوں نہ ہو، جس کا تصورِ حیات اتنا پست ہو، کہ اس کے افراد کھانے پینے سیر و تفریح اور اسی قسم کے دیگر مادی مسائل کے علاوہ کسی رُوحانی، اخلاقی یا ذہنی مسئلہ سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں انسان کی تقلیدی روش خواہ وُہ آبا و اجداد کی تقلید ہو، یا گرد و پیش کی ترقی یافتہ قوموں کی تقلید ہو، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ زندگی کے بلند حقائق اور مقاصد سے غافل ہو کر اس نے حیاتِ دُنیوی کی ادنیٰ لذّتوں اور مسرتوں کے حصول کو اپنا واحد مطمحِ نظر بنا لیا ہے۔ اس لئے وُہ اپنے مشاہدات و تجربات کے سطحی اور ظاہری معنوں کے سوا ان کے حقیقی اسرار اور پنہاں مطالب تک پہنچنے کی زحمت نہیں گوارا کرتا۔۔۔ چنانچہ ہمارے ملّاؤں اور مغرب زدہ طبقوں کی زندگی سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ ان لوگوں کو سیر و تفریح، کھانے پینے اور دیگر نفسانی لذّتوں کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی باقی نہیں رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ان میں فکر کی گہرائی اور عقل کی صحیح بصیرت مفقود ہوتی جا رہی ہے، البتہ یہ لوگ روزمرہ کے معاملات اور معمولی باتوں میں جو ان کے ذاتی مفاد سے تعلق رکھتی ہیں بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ جو بنے بنائے طریقے اُنہوں نے اپنے آبا و اجداد یا اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے ورثہ میں پائے ہیں، ان پر اندھے پن سے چلتے رہنے کو یہ لوگ بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ جب ان طریقوں میں تبدیلی پیدا کرنے کا مطالبہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، تو ملّاؤں کا طبقہ یہ کہہ کر اس مطالبہ کو رد کر دیتا ہے، کہ تم کافر اور دہریہ ہو، اور دُوسرا طبقہ فوراً انگریزوں اور امریکہ کے باشندوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے، کہ دیکھتے نہیں یہ دونوں قومیں کتنی ترقی یافتہ اور خوشحال ہیں؟ اس لئے ان کا طرزِ فکر اور طریقِ حیات کیسے غلط ہو سکتا ہے، ان بیچاروں کو ابھی تک یہ احساس نہیں کہ جن قوموں کی یہ تقلید کر رہے ہیں وُہ نہایت تیزی کے ساتھ فنا و ہلاکت کی طرف بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کی مصنوعی اور بے روح تہذیب اپنی شکست کے اسباب اپنے ہاتھوں خود جمع کر رہی ہے۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

تقلیدی رجحانات کے علاوہ زوال پذیر قوموں اور طبقوں کی ایک اور خصوصیت قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وُہ ظالم اور بدکردار لوگوں کی حکومت کو بغیر کسی مزاحمت اور احتجاج کے خوشی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قوم عاد کے متعلق قرآن فرماتا ہے :—

وتلك عَادٌ جحدو بآياتِ ربّهم	یہ عاد تھے جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا
وعصو رسُلهُ واتّبعُوا امر كلّ	اور ہر ایک ظالم اور نافرمان حکمران کے احکام کی بچون
جبّار عنيد	وچرا اطاعت کرتے رہے۔

اسی بات کو قرآن نے ایک جگہ اور یوں بیان کیا ہے :—

اذْ تبرّا الذين اتّبعوا من الذين	جب لیڈر اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے
اتّبعُوا ورا والعذاب وتقطّعت	اور عذاب کو دیکھیں گے، اور اُن کے تعلّقات کٹ
بهم الاسباب وقال الذين	جائینگے، اور انکے پیرو کہنے لگیں گے کہ کاش ہمیں دُنیا
اتّبعُوا لو انّ لنا كرّةً فنتبرّاءُ	میں پھر واپس جانا ہوتا، تو ہم اُن سے اسی طرح بیزار
منهم كما تبرّؤ منّا۔	ہوتے جس طرح آج وُہ ہم سے بیزار ہیں —

آخری آیت میں قرآن نے روز قیامت کا نقشہ کھینچا ہے، کہ اُس دن وُہ تمام لیڈر جنھوں نے اپنی اپنی قوم کو گمراہ کیا تھا، اپنے ماننے والوں کے اعمال سے خود کو بری الذمّہ قرار دینگے، اور ان لیڈروں کے ماننے والے اور انکے پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ اگر ہمارے لئے دُنیا میں واپس جانا ممکن ہوتا، تو ہم بھی اِن لیڈروں کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ ابتداء میں تو عوام الناس بغیر کسی مزاحمت اور مخالفت کے ظالم اور بدکردار لیڈروں کی قیادت کو برداشت کر لیتے ہیں، لیکن جب ان کی غلط رہنمائی سے سوسائٹی میں ظلم و فساد اور عیش پرورش پانے لگتا ہے اور انجام کار تاریخ اِس پوری قوم سے اِسکی غفلتوں اور عیش پسندیوں کا انتقام لینا شروع کرتی ہے تب عام لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ان لیڈروں کی اطاعت کرنے میں بڑی سخت غلطی کی، کاش کہ قدرت ہمیں پھر ایک بار موقعہ دیتی تو ہم اچھے لیڈروں ________ کا انتخاب کرتے لیکن چونکہ تاریخ کے انتقامی عمل کا آغاز ہونے کے بعد پھر اس قسم کے تجربات کا موقعہ باقی نہیں رہتا، اسلئے انکی یہ آرزو رائیگاں جاتی

ہے، اور ساری قوم جن میں اچھے برے سبھی شامل ہوتے ہیں اس عذابِ تاریخ کی نذر ہو کر اجتماعی حیثیت سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے، قومیں اپنے لیڈروں اور حکمرانوں کے عزل و نصب میں اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کیوں کرتی ہیں، اس کی وجہ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تملیکی جذبات (Acquisitive desires) کا غلبہ اور تخلیق و تعمیر کے جوش کی کمی اس گناہ کا اصلی سبب ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب تک قوم پر راست کردار لوگوں کا اثر قائم رہتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے نظام اور پروپاگنڈے کے وسائل سے قوم میں تخلیقی جذبات اور تعمیری امنگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ایسے میلانات و جذبات کو سختی سے دبا دیتے ہیں جن سے تعیش، آرام پسندی، نفس پرستی، اور دولت و ثروت کی ہوس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن جب قوم کی لیڈر شپ غلط اشخاص کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ تو اس کی دیکھا دیکھی ساری قوم نفس پرستی، تعیش اور دولت کی ہوس میں گرفتار ہو جاتی ہے جس سے قوم میں اتحاد کی جگہ اختلاف و انتشار پیدا ہونے لگتا ہے اور لوگ تعمیری کاموں کے بجائے اپنی ذاتی بڑائی اور ترقی کے لئے طرح طرح کی بداخلاقیوں کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ ساری جتھے بندیاں اور پارٹی بندیاں اس اساس و بنیاد پر وجود میں آتی ہیں کہ فلاں فلاں گروہ اور فلاں فلاں خاندان کے بجائے ملک کا سیاسی اقتدار اور اس کے معاشی وسائل ہمارے ہاتھ آئیں۔

اس کشمکشِ اقتدار اور جنگِ زرگری کے باعث جب اجتماعی حالات خراب سے خراب تر ہو جاتے ہیں اور عوام اور متوسط طبقات کو بھی ان خرابیوں کا احساس ہونے لگتا ہے، تو قوم کے حساس اور باعمل افراد میدان میں آنا چاہتے ہیں، تاکہ اس کی اصلاح و تعمیر کا کام انجام دیں۔

لیکن اس قسم کی اصلاحی اور تعمیری جدّ و جہد کیلئے مالی ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے مقصد کے لئے جان بھی دینی پڑتی ہے، اس لئے زوال پذیر قوموں میں اکثر و بیشتر اصلاح احوال اور تعمیر معاشرت کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، کیونکہ قوم کی بہت بڑی اکثریت راحت پسندی، لذّت طلبی اور عیش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مصلحوں کا ساتھ نہیں دیتی جس ملک میں دولت کو واحد معیار عزت

تسلیم کیا جاتا ہو جس میں اعلیٰ تعمیری مقاصد اور اجتماعی اغراض کے لئے مالی ایثار اور جانی قربانیاں کرنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہو، اس میں چند حساس اور باشعور افراد کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اگر دو چار افراد میدان میں آکر ——— معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، اور ملک کی عام آبادی ان کا ساتھ نہ دے تو ان کی جدوجہد اور قربانیوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا لیکن عام افرادِ قوم ان اصلاح پسندوں اور تعمیری ذوق رکھنے والے اشخاص کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں، جبکہ وہ مادی اقدار و لذات کی پرستش میں مبتلا ہو کر مجاہدانہ سرفروشی کے جذبہ سے خالی ہو چکے ہوں یہ ظاہر ہے کہ اگر قوم کی بہت بڑی اکثریت زندگی کی حقیر لذتوں اور مسرتوں کے پیچھے دیوانی ہو، اور اس میں کسی حیاتِ برتر کا تصور نہ باقی ہو، تو اس قسم کی اصلاحی اور تعمیری جدوجہد میں جو انسان سے ایثارِ نفس، جفاکشی اور مالی قربانیوں کا مطالبہ کرے، بہت کم لوگ حصہ لینے کے لئے آمادہ ہوں گے اس لئے اکثر اوقات ہوتا یہ ہے، کہ جو لوگ ——— اپنے ملک و قوم کے حالات سے بددل اور غیر مطمئن ہو کر اخلاص اور سچائی کے ساتھ اصلاحِ حال کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قوم کی لذت پرستی، عیش طلبی اور غفلت شعاری کے باعث بے بس اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ملک و قوم کی اخلاقی خرابیوں کے واقعتاً ذمہ دار ہیں، وہ بغیر کسی رکاوٹ، مزاحمت یا احتجاج کے اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا آخری انجام وہی ہوتا ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے یعنی بالآخر قانونِ مکافاتِ عمل کے ناگزیر نتائج سامنے آنے لگتے ہیں۔ اور تاریخ کا دستِ انتقام اپنا وار شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت لوگوں کو احساس ہوتا ہے، کہ ہم نے غلط لیڈروں کی اطاعت کر کے اور خوشنما مذہبی نعروں سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اس اجتماعی آفت میں مبتلا کیا۔ کاش کہ ہمیں پھر ایک بار موقعہ دیا جاتا لیکن قدرت کا وقت موعود آ جانے کے بعد پھر ٹل نہیں سکتا اس لئے پوری قوم شکست و ادبار میں مبتلا ہو کر اجتماعی حیثیت سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

البتہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند حساس اور مخلص انسان مل کر پوری قوت اور جدوجہد سے قوم کے باشعور اور سمجھدار افراد کی تائید و حمایت کے ساتھ اپنی اصلاحی

تحریک پھیلاتے رہتے ہیں، اور زردار طبقوں کے تمام مظالم اور سختیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ انھیں بالآخر اپنے مخالفین پر فتح حاصل ہوتی ہے، اسی قلیل التعداد گروہ کے متعلق جس کے کردار عمل کو دیکھ کر قوم اس کے اخلاص اور سچائی پر اعتماد کرنے لگتی ہے، قرآن فرماتا ہے :—

وکم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہ و اللہُ مع الصابرین۔

اور کتنی ہی قلیل التعداد اور مختصر جماعتیں ہیں جو اللہ کی مدد سے بڑی بڑی کثیر التعداد جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں کیونکہ اللہ انھیں کا ساتھ دیتا ہے جو اپنے مقصد اور نصب العین کیلئے ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرلیں

یعنی یہ نہیں سمجھنا چاہیئے، کہ اگر کسی اصلاحی گروہ کی تعداد اور معاشی طاقت کم ہے تو وہ لازمًا اس کشمکش میں ناکام ہی ہوگا، جو وہ ظالموں اور عیش پرستوں کے خلاف برپا کرتا ہے، اس کے برعکس اگر وہ واقعتًا قوم کا مخلص اور حق و صداقت پر قائم ہو، اور اپنی جد و جہد سے یہ ثابت کر دے۔ کہ وہ کسی خاص طبقہ کے مفاد کی خاطر میدان عمل میں نہیں آیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی جد و جہد کو ضرور کامیاب کرتا ہے، چنانچہ تاریخ میں جتنے انقلابات ہوئے ہیں، ان کے برپا کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہی تھی۔ لیکن وہ اپنے ملک یا انسانیت کے سچے ہی خواہ تھے، اور جس مقصد کو انہوں نے اختیار کیا، اس کے لئے کوئی ایثار، کوئی قربانی اور کوئی تکلیف ایسی نہ تھی، جس کو اُنھوں نے خوشی خوشی برداشت کیا ہو۔ قرآن نے حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کے سلسلہ میں حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ایک کامیاب اور قیمتی اصلاحی گروہ اور ایک انحطاط پذیر اور مائل بہ شکست حکمران طبقہ کی جو اخلاقی حالت اور صفات بیان کی ہیں، ان کا اطلاق تاریخ کے ہر بڑے انقلاب پر کیا جا سکتا ہے، چنانچہ قرآن ارشاد فرماتا ہے :—

و قال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ و قومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک و الھتک۔ قال موسیٰ

فرعون کے امراء اور درباریوں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اسکی قوم کو یونہی چھوڑ دیگا۔ تاکہ وہ زمین پر فساد مچائیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور اپنے مقصد کیلئے

لقومہ استعینوا باللہ
واصبروا - ان الارض للہ یورثها
من یشاء والعاقبۃ للمتقین
قالوا اوذینا من قبل ان
تاتینا ومن بعد ما جئتنا -
قال عسیٰ ربکم ان
یهلک عدوکم ویستخلفکم
فی الارض فینظر کیف تعملون -

صبر و تحمل سے تکالیف برداشت کرو، زمین تو اللہ
کی ہے وہ جسکو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے
اور انجام کار تو بالآخر انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو مکافات
عمل سے خوف کھاتے ہیں۔ انھوں نے کہا موسیٰ تمہارے آنے سے
پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تمہارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ
نے کہا کہ تمہارا رب عنقریب تمہارے دشمن کو ہلاک کرنے والا
ہے۔ اور اس کی جگہ تمہیں زمین کی خلافت عطا کرے گا
تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو -

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام یعنی ایک اصلاحی گروہ کے لیڈر کو فرعون اور اس کے اُمراء نے بانیٔ فساد قرار دیا ہے، حالانکہ در اصل فساد کے بانی وہ خود تھے۔ یہ الزام تاریخ کی ہر اجتماعی جدوجہد کے رہنماؤں پر ظالم سلطنتوں ——— کی طرف سے وارد کیا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک غلط اور ظالمانہ نظام کو شکست کرکے یا کسی ظالم قوم کی محکومی سے آزادی حاصل کرکے ایک صحیح طرز کا معاشرہ یا ایک آزاد قومی حکومت قائم کرنے میں جو درمیانی عرصہ گزرتا ہے اس میں تھوڑی سی بدنظمی اور خونریزی ضرور ہوتی ہے -

اسلام کا نظریۂ تاریخ

حصّۂ دوم

رُومی تہذیب

رومی سلطنت مسلمانوں سے پہلے دُنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی۔ قدیم رومی جمہوروں نے چند منتشر آبادیوں سے ترقی کر کے پہلے اٹلی میں ایک خود مختار ریاست قائم کی اور پھر ساری مہذب دُنیا کے لیڈر بن گئے۔ اپنی جفاکشی، محنت، جنگجوئی، سادہ عادات اور جمہوری روایات کے باعث ہمعصر قوموں میں ممتاز تھے۔ جب انھوں نے کشور کشائی اور ملک گیری کا پہلا قدم اٹھایا تو وہ معاشی حیثیت سے کمزور لیکن جان فروشی، شجاعت اور حب الوطنی میں قوی تھے۔ ان میں دنیوی شان و شوکت اور ظاہری آرائش و زیبائش کی کوئی علامات نہیں پائی جاتی ہیں۔

اس کے برعکس ان کی زندگی نہایت سادہ اور ان کی سوسائٹی عدم مساوات سے پاک تھی۔ ان میں غریب بھی تھے اور امیر بھی لیکن دونوں ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرتے تھے۔ رومیوں کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے شہنشاہیت اور ملوکیت کا خاتمہ کر کے اپنے ملک میں ایک سادہ جمہوری نظام قائم کیا جس میں عوام کی آزادی اور حقوق کا پورا پورا تحفظ موجود تھا۔ اس عظیم الشان قوم کو زوال و انحطاط نے کیونکر آ لیا اور انہوں نے

رفتہ رفتہ اپنی سادگی، محنت، جفاکشی اور حب الوطنی کی خصوصیات کس طرح کھو دیں اس کا حال ایڈورڈ گبن (GIBBON) کی مشہور تاریخ زوالِ سلطنتِ روما (DECLINE AND-) OF THE ROMAN EMPIRE) سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم رومیوں کے دور زوال کے خصوصیات پر بحث کرنے کے لئے اس مشہور تاریخ سے حسب ذیل اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ قوموں کے زوال و انحطاط میں کن اسباب و عوامل کو دخل ہوا کرتا ہے:۔

آغسطس (AUGUSTUS) کا آمرانہ طرزِ حکومت

آغسطس نے سنات (SENATE) کے وقار و احترام کو از سرِ نو قائم کیا لیکن اس کے اثر اور اس کی خود مختاری کو بالکل مٹا دیا۔ اس کے دورِ حکومت کے آغاز سے سنات رومی سلطنت کے حاکمِ اعلیٰ کی ایک نامزد کردہ جماعت بن گئی اور ایک خود مختار اور با اقتدار جماعت کی حیثیت سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔

آغسطس کی خدمات کے صلہ میں سنات نے اس کو پوری سلطنت روما کا مالک اور مطلق العنان حکمران بنانا منظور کیا اور اس کی یہ تجویز مان لی کہ زمانۂ امن میں بھی رومی فوجوں کی کمان اسی کے ہاتھ میں رہے۔ اس طرح آغسطس نے فوجی قوت اپنے ہاتھ میں لے کر روما کو ایک مطلق العنان آمریت بنا دیا۔ اگرچہ آغسطس فوجی طاقت کو اپنی سلطنت کا محفوظ ترین سہارا خیال کرتا تھا لیکن یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حکومت فوج پر موقوف ہے۔ چنانچہ اس نے قدیم زمانہ کی جمہوری اصطلاحات اور جمہوری عہدوں کو قائم رکھنا مناسب خیال کیا اور خود ایک اعلیٰ ترین مجسٹریٹ کی حیثیت اختیار کی۔ اس غرض سے اس نے سنات کو اجازت دی کہ وہ اُسے قونصل (CONSUL) اور ٹریبیون (TRIBUNE) دونوں کے جذبات و اختیارات تفویض کرے۔ قونصل قدیم رومی جمہوریت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار ہوتے تھے جنھیں روم کے بادشاہوں کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ عوام ان کو ایک سال کی مدت کے لئے منتخب کرتے تھے لیکن تعداد میں یہ ایک کے بجائے دو ہوتے تھے تاکہ ان میں سے کوئی بھی زیادہ طاقتور نہ بن سکے۔ اس طرح آغسطس نے قونصل اور ٹریبیون کے اختیارات

حاصل کرلئے۔ پھر جب عاملہ (EXECUTIVE) کے تمام اختیارات اس شاہی مجسٹریٹ کو حاصل ہو گئے تو سلطنت کے معمولی مجسٹریٹ بالکل گمنام، بے اختیار اور بیکار ہو گئے لیکن آغسطس نے بڑی ہوشیاری سے قدیم جمہوریت کے ظاہری اشکال قائم رکھے چنانچہ جمہوری دور میں جتنے قونصل، پریٹر، اور ٹرائیبیون ہوتے تھے۔ آگسطس بھی اسی تعداد میں ان عہدوں پر تقررات کیا کرتا تھا۔

مختصر الفاظ میں رومی سلطنت اب ایک شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی جس پر جمہوری اصطلاحات و اشکال کا خوشنما پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ روما کے یہ شہنشاہی آقا اپنے آمرانہ اختیارات اور مطلق العنان اقتدار کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھتا اور یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ سنات کے آگے ذمہ دار ہیں حالانکہ سنات درحقیقت انہیں کی مٹھی میں تھی۔

آغسطس اپنے چچا سیزر (CAESAR) کے قتل کا منظر دیکھ چکا تھا۔ سیزر نے اپنے حامیوں پر زر و جواہر اور انعامات و کرامات کی بارش کر دی تھی۔ لیکن اس کے بعض نہایت عزیز دوست اس سازش میں شریک تھے جو اس کے قتل پر منتج ہوئی۔ فوجوں کی وفاداری ایسے کھلی ہوئی بغاوتوں سے بچا سکتی تھی لیکن جمہوریت پسندوں کی خفیہ کارروائیوں اور قاتلانہ حملوں کے خلاف اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ رومی عوام کے دلوں میں ابھی بروٹس (BRUTUS.) کی یاد تازہ تھی۔ اور ابھی تک اس کی پیروی اور تقلید کرنے والوں کو عوام حسنِ عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سیزر کا جو انجام ہوا تھا۔ اس کی صرف یہی وجہ نہیں تھی کہ وہ مطلق العنان حکمران بن بیٹھا تھا بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مطلق العنانی کا علانیہ مظاہرہ کرتا تھا۔ آغسطس سمجھدار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا والے ظاہری اصطلاحات اور خارجی رسوم و شعائر پر جان دیتے ہیں۔ اس کی یہ توقع غلط نہ تھی کہ رومی سنات اور عوام غلامی کا جوا اٹھانے پر تیار ہو جائیں گے بشرطیکہ انہیں اس دھوکہ میں رکھا جائے کہ ان کی قدیم آزادی قائم ہے۔ چنانچہ ایک کمزور سنات اور دلدادہ عیش قوم اس فریب میں اس وقت تک مبتلا رہی۔ جب تک آغسطس اور اس کے جانشین اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے رہے کیلی گولا (CALIGULA) نیرو (NERO) اور ڈومیشین (DOMITIAN.) پر جو قاتلانہ حملے ہوئے ان کا محرک

خیال نہ تھا کہ روما کی قدیم جمہوریت کا احیاء کیا جائے بلکہ قاتلوں نے اپنے ذاتی تحفظ کی خاطر یہ خطرناک قدم اٹھایا۔ اُن کا حملہ ظالم بادشاہوں کی ذات پر تھا نہ کہ ان کے غیر جمہوری اور ظالمانہ طرزِ حکومت پر۔

روما کی تاریخ میں ایک وقت ایسا ضرور آیا جبکہ سنات نے ستر سال کے صبر و تحمل کے بعد اپنے حقوق و اختیارات واپس لینے کی ایک ناکام کوشش کی کیلی گولا کے قتل کے بعد جب تختِ شاہی خالی ہوگیا تو قونصلوں نے سنات کا جلسہ طلب کرکے سابق حکمرانوں کے طرزِ حکومت کی مذمت کی اور اڑتالیس گھنٹوں تک ایک آزاد اور جمہوری سلطنت کے خادموں کی حیثیت سے حکومت کا کام انجام دیا۔ لیکن ادھر وہ اپنے مشوروں اور عزائم میں مصروف تھے ادھر پریطوری محافظ دستوں (PRAETORIAN GUARDS) نے کلاڈیس کو شہنشاہ بناکر اس کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سنات کا خواب آزادی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور اسے چاروناچار نئے شہنشاہ کی غلامی کا جوا قبول کرلیا عوام نے سنات کی حمایت میں ایک آواز بھی نہیں اُٹھائی اور فوج نے اسے تشدد کی دھمکی دی۔ ان حالات میں سنات کو پریطوری محافظ دستوں کے انتخاب کی توثیق کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا۔

فوجیوں کی خودسری

گالبا (GALBA) آتھو (OTHO) اور وٹیلیس (VITELLUS) تینوں شہنشاہوں کے انجام نے فوجیوں کے دل میں یہ یقین پیدا کردیا کہ شہنشاہوں کا عزل و نصب ان کے ہاتھ میں ہے

ملکی سیاسیات پر نسوانی اثرات

اپنے آخری ایام میں آگسٹس نے اپنی مرضی کے خلاف اور محض اپنی بیوی لیویا (LIVIA) کو خوش کرنے کے لئے ٹائبیریس کلاڈیس (TIBERIUS CLAUDIUS) کو جو اس کے پہلے شوہر کا بیٹا تھا اپنا جانشین نامزد کیا۔ ٹائبیریس کے بعد کیلی گولا تختِ شاہی کا مالک بنا اور کیلی گولا کی موت پر اس کا چچا کلاڈیس تخت نشین ہوا۔ یہ شہنشاہ اپنی بیویوں مسالینا (MESSA-LINA)

اور اگریپینا (AGRIPPINA) کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح ناچتا رہا۔ چنانچہ اگریپنا نے اپنے پہلے شوہر کے بیٹے نیرو کو تخت نشین کرنے کے لیے کلاڈیس کو زہر دے دیا۔
فاسٹینا (FAUSTINA) جو مارکس آریلیس (MARCUS AURELIUS) کی بیوی تھی اپنی عشق بازی کے لیے بھی اتنی ہی مشہور تھی جتنی اپنے حسن کے لئے مارکس ہی سلطنت میں اکیلا فرد تھا جو یا تو اپنی بیوی کی حرکتوں سے ناواقف تھا یا دیدہ و دانستہ اس سے چشم پوشی کرتا تھا۔ تیس سال کے دور حکومت میں اس نے فاسٹینا کے کئی ایک عاشقوں کو بڑے بڑے عہدوں پہ ترقی دی بلکہ بیوی کی وفات کے بعد بھی وہ اس کی محبت میں گرفتار رہا۔ چنانچہ اس نے سنات سے خواہش کی کہ وہ فاسٹینا کو مرتبہ الوہیت (DIVINITY) سے سرفراز کرے۔ سنات نے جو حسب سابق خوشامدیوں کی ایک جماعت تھی۔ اس کی یہ خواہش پوری کر دی اور فاسٹینا کو دیویوں کے زمرہ میں شامل کر دینے کا اعلان کیا۔
کموڈس (COMMODUS) کے زمانہ یعنی ۱۸۹ء میں روم پر قحط اور بیماریوں کا ایک بڑا حملہ ہوا۔ بیماری کے متعلق تو عام خیال یہ تھا کہ یہ خدا کے غیض و غضب کی نشانی ہے لیکن قحط کے بارے میں لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ شہنشاہ کے دست راست کلینڈر (CLEANDER) کے غیر معمولی اقتدار، دولت و ثروت نیز اس اجارہ داری کا نتیجہ ہے جو غلہ کی خرید و فروخت کے متعلق چند بڑے بڑے تاجروں کو حاصل ہو گئی ہے۔ عوام نے جو سرکس میں تفریح اور عیش و نشاط کی غرض سے جمع ہوتے تھے غیض و غضب میں آکر شاہی محل کو گھیر لیا۔ اور جب کلینڈر نے فوج کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے حکم دیا تو پیدل فوج جو سواروں کے مخصوص حقوق و مراعات کے پیش نظر اپنی کس مپرسی سے نالاں تھی عوام کے ساتھ مل گئی۔ اب عوام نے اپنی طاقت محسوس کر کے کلینڈر کو قتل کر دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن یہ خبر کموڈس تک کون پہنچاتا۔ بالآخر فیڈیلا اور مارشیا نے جو اس کی دو چہیتی داشتہ عورتیں تھیں شہنشاہ کو اس صورت حال کی خبر کی۔ کموڈس نے خیریت اسی میں دیکھی کہ اپنے دست راست کلینڈر کو عوام کے مطالبہ پر قربان کر دے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ کلینڈر کو قتل کر کے اس کا سر شاہی محل کے باہر پھینک دیا جائے۔

کموڈس کی خانگی زندگی کے متعلق گبن (GIBBON) لکھتا ہے کہ وہ تین سو حسین عورتوں اور نوجوان لڑکوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی ناشائستہ حرکات جن کا قدیم مؤرخوں نے تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے مہذب قوموں کی زبان میں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ کموڈس کو علم و فضل، شعر و شاعری غرضیکہ ہر سنجیدہ اور شائستہ چیز سے نفرت تھی۔ سرکس کے کھیل، پیشہ ور تیغ زنوں (GALDIATORS) کے مظاہرے، تھیٹر کے تماشے اور جنگلی جانوروں کا شکار اس کے محبوب مشاغل تھے۔ اس کے ساتھیوں اور ہمنشینوں میں ان علما اور فضلا کی کھلم کھلا ہنسی اڑائی جاتی تھی جنہیں مارکس نے اس کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا تھا۔ پہلوانوں، شکاریوں اور دوسرے تفریحی مشاغل کے پیشہ ور ماہرین کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ عوام اور متوسط طبقات جن کے وسائل معاش شہنشاہ کے ہاتھ میں تھے۔ اس کی ناشائستہ زندگی کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے وہ دیوتاؤں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے بالآخر اس کی ظالمانہ کارروائیوں اور انتقامی جذبے نے خود اس کی محبوبہ مارشیا اور پریطوری سردار لیٹس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ کہیں وہ بھی اس کے غیظ و غضب اور بے اصولی کا شکار نہ بن جائیں۔ اس خوف سے مارشیا نے کموڈس کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

اصلاحی کوششوں کی ناکامی

کموڈس کے بعد فوجیوں کی نگاہ انتخاب پرٹناکس (PERTINAX) پر پڑی جو سنات کا ایک قدیم رکن تھا۔ پرٹناکس کے انکار کے باوجود فوجی سرداروں کے دباؤ سے اس کو شہنشاہ کا منصب قبول کرنا پڑا۔ پرٹناکس نے وہ تمام ظالمانہ محاصل منسوخ کر دیئے جو کموڈس نے ایجاد کئے تھے۔ اس نے اپنے ایک اعلان میں بتایا کہ وہ ایک غریب جمہوریہ پر انصاف کے ساتھ حکومت کرنے کو اس سے بہتر سمجھتا ہے کہ ظالمانہ طریقوں سے دولت حاصل کرے۔ اس نے اعلان میں اس بات پر زور دیا کہ کفایت شعاری اور محنت و جفاکشی دولت پیدا کرنے کا اصلی اور سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ چنانچہ اپنی محنت اور

کفایت شعارانہ نظم و نسق سے اس نے ملکی ضروریات کے لئے کافی آمدنی پیدا کرلی۔ شاہی محل کے مصارف تقریباً نصف رہ گئے۔ عیش و عشرت کے تمام سامان مثلاً سونے اور چاندی کے برتن، عمدہ عمدہ گاڑیاں ریشم کے قیمتی مگر غیر ضروری ملبوسات اور بہت سی حسین لڑکیاں اور لڑکے جو شاہی محل میں غلاموں کی حیثیت سے کام کرتے تھے نیلام کر دیئے گئے۔ پرٹناکس کی اس روش نے عوام کے دل میں اس کی بے حد قدر و محبت پیدا کر دی لیکن رومی قوم اتنے عرصہ دراز سے اخلاقی امراض اور عیش و عشرت کی عادات میں مبتلا تھی کہ اس کی اتنی جلد اصلاح کرنا ایک ناممکن امر تھا چنانچہ پرٹناکس کو اپنی مصالحانہ کوششوں کی بدولت بہت جلد تخت حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ پریطوری محافظ دستہ (PRETORIAN GUARDS) جو سابقہ ادوار کی آرام پسندیوں اور عیش پرستیوں کا دلدادہ تھا۔ اس کی کفایت شعاری اور نظم و ضبط سے سخت برہم ہو گیا۔ ان فوجیوں کو گذشتہ عہد حکومت کی دلچسپیوں کی یاد ہر وقت غیر مطمئن رکھتی تھی۔ چنانچہ کموڈس کی موت کے چھیاسی روز بعد پریطوریوں کی سازش سے پرٹناکس کو اپنے خلوص و صداقت اور اصلاح پسندی کی قیمت ادا کرنی پڑی اور دو سرکش سپاہیوں نے فوجی کیمپ میں اس کا کام تمام کر دیا۔

پریطوری دستہ کا نظام

ان پریطوری محافظ دستوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے :۔

اس فوج کا قیام آغسطس کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ یہ چالاک مگر مستبد حکمران جانتا تھا کہ وہ صرف فوجی طاقت کے بل پر اپنی ظالمانہ حکومت قائم رکھ سکتا ہے اس لیئے اس نے اپنی ذاتی حفاظت نیز سینیٹ کو ڈرانے دھمکانے اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے رفتہ رفتہ اس محافظ فوج کی تشکیل کی۔ چنانچہ اس فوج کے سپاہیوں کو عام فوجیوں کے مقابلہ میں دوگنی تنخواہ ملتی تھی اور اس کے علاوہ انھیں بہت سے مخصوص مراعات بھی دیئے گئے لیکن چونکہ دارالسلطنت میں اس فوج کے قیام سے عوام میں ناراضگی پھیلنے کا اندیشہ تھا، اس لئے اس نے روم میں صرف تین دستے مقرر کئے اور بقیہ دستوں

کو اطالیہ کے دوسرے شہروں میں جو روم سے زیادہ قریب تھے بھیج دیا۔ ایک متمول شہر کی عیش پسندانہ فضا میں رہتے رہتے پریطوری سپاہیوں میں اپنی طاقت و شوکت کا غرور پیدا ہو گیا۔ وہ جانتے تھے کہ خود شہنشاہ اپنی ذات کی حفاظت کے لئے اس کا دست نگر ہے۔ نیز سنات کا اقتدار، ملک کا خزانہ اور ایک وسیع سلطنت کا قلب و مرکز بھی انھیں کے رحم و کرم پر ہے ان کے اس احساسِ طاقت کو قابو میں رکھنے کے لئے بادشاہوں کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ وہ یکے بعد دیگرے نرمی اور سختی، محبت اور طاقت، خوشامد اور رعب و داب سے کام لے کر انھیں قابو میں رکھیں۔

پریطوریوں نے پرٹناکس کو قتل کر دیا لیکن اس کی جانشینی کے لئے وہ کسی موزوں آدمی کا انتخاب نہ کر سکے۔ سلپی سی انس (SULPICIANUS) نے جو پرٹناکس کا خسر تھا پریطوریوں کے لالچ سے فائدہ اٹھا کر انھیں ایک بہت بڑی رقم رشوت کے طور پر پیش کی تاکہ وہ اس کو شہنشاہی کی مسند پر بٹھا دیں لیکن پریطوریوں نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ شہنشاہ اسی کو بنائیں گے جو انہیں سب سے زیادہ رشوت کھلا سکے۔ اس اعلان سے پورے دارالسلطنت میں شرم و غیرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن جب یہ خبر ڈی ڈیس جولیانس (DIDIUS JULIANUS.) کے کانوں تک پہنچی جو ایک متمول رکن سنات تھا اور ان قومی مصائب میں دل کھول کر داد عیش دے رہا تھا تو اس نے سلپی سی انس کے پانچ ہزار رومی سکوں (ایک سو ساٹھ پاؤنڈ) کے مقابلہ میں ساڑھے چھ ہزار سکوں کا پیش کش کیا جو تقریباً دو سو پاؤنڈ کے برابر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پریطوریوں نے فوراً اس کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا اور سنات کو حکم دیا کہ وہ اپنا اجلاس منعقد کر کے جولیانس کی شہنشاہی کا اعلان کر دے۔

ادھر پانونی فوج (PANNONIAN ARMY) کے کمانڈر سیپٹی میس سیویرس (SEPTIMIUS SEVERUS) نے جو افریقہ کا باشندہ تھا پرٹناکس کے قتل کی خبر پاتے ہی اپنی فوج کو جمع کیا اور پریطوریوں کے مظالم کی داستان بیان کر کے انھیں انتقام پر ابھارا۔ اس کے علاوہ اس نے ہر سپاہی کو تقریباً چار سو پونڈ کی رقم دینے کا

وعدہ کیا جو جولیانس کی پیش کردہ رقم سے دوگنی تھی۔ چنانچہ اس کی فوج نے فوراً اُسے شہنشاہ تسلیم کر لیا اور بالآخر وہ اس فوج کی طاقت سے اپنے حریف جولیانس پر غالب آگیا اور روم کا مستقل شہنشاہ بن بیٹھا۔

مالی مشکلات اور عوام پر محاصل کا بار

کموڈس کی عیش پرستی اور ظلم و ستم۔ اس کی موت کے بعد رومیوں کی باہمی خانہ جنگی نیز سیویرس کی نئی پالیسی کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ فوج کی طاقت بہت بڑھ گئی اور رومائی رہی سہی قانونی اور دستوری آزادیاں بھی جن کا صرف نام ہی نام رہ گیا تھا بالکل ختم ہو گئیں۔ اس اندرونی انقلاب نے سلطنت کے نظام کو بالکل کھوکھلا کر دیا۔ البتہ اس دور کا ایک مشہور واقعہ یہ تھا کہ کیرا کلا (Caracalla) نے رومی شہریت (Roman citizenship) کے حقوق و مراعات صوبوں کے باشندوں کو بھی عطا کئے جن سے وہ اب تک محروم تھے لیکن یہ فیاضانہ پالیسی کسی حقیقی بہی خواہی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ محض طمع اور ہوس دولت پر مبنی تھی۔ جس کی توجیہہ ذیل کے واقعات سے ہو گی۔

ویائی (VEII) کا محاصرہ جو رومیوں کا پہلا بڑا معرکہ تھا ان کی ناتجربہ کاری کے باعث دس سال کی مدت تک طول کھینچ گیا۔

اتنی بہت سی سرمائی مہموں کی سختیاں اور وہ بھی گھر سے بیس میل کے فاصلہ پر بغیر اس کے ناممکن تھیں۔ کہ رومی سپاہیوں کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کر دی جائیں۔ چنانچہ ان تنخواہوں کی ادائیگی کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ تمام رومی باشندے ایک عام محصول ادا کرتے تھے جو ان کی املاک کے تناسب سے وصول کیا جاتا تھا۔ ویائی کی فتح کے دو سو سال بعد تک جمہوریہ روما کی فتوحات نے اہل روم کی آمدنی اور دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ البتہ ان کی سلطنت کی وسعت روز بروز بڑھتی گئی۔ قرطاجنہ (Carthage) سے لڑائیوں میں جن میں بڑی بڑی افواج نے حصہ لیا، ان کی تنخواہوں اور مصارف کی ادائیگی رومیوں کے اپنے ذمہ تھی۔ کیونکہ روما کی آمدنی کا کوئی بیرونی ذریعہ نہیں تھا۔ عالیمت،

رومیوں نے ان غیر معمولی مصارف کو بلا جبر و اکراہ خوشی خوشی اپنی گرہ سے ادا کرنا منظور کیا
ان کی یہ توقع غلط ثابت نہیں ہوئی کہ اس قربانی سے آئندہ چل کر انہیں کئی گنا زیادہ
نفع وصول ہوگا۔ چنانچہ سائیراکیوز (SYRACUSE) قرطاجنہ (CARTHAGE)
مقدونیہ (MACEDONIA.) اور ایشیا کی دولت رومی باشندوں کے
ہاتھ آئی۔ اس طرح اہل روما ہمیشہ کے لئے محاصل کے بار سے بچ گئے۔ ملک کی بڑھتی
ہوئی آمدنی فوج اور نظم و نسق کے مصارف کے لئے کافی ہو جاتی تھی اور اس میں سے
جو رقم فاضل ہو کر بچ جاتی وہ ایک مشہور دیوتا (SATURN) کے مندر میں محفوظ
کر دی جاتی - تاکہ کسی آڑے وقت کام آسکے۔ پامپی کی فتوحات نے روما کی دولت اور
وسائل آمدنی میں بے انتہا اضافہ کیا۔ ایشیا کے محاصل کی آمدنی پانچ کروڑ رومی سکون
...... یعنی تقریباً چالیس کروڑ پاؤنڈ ہوگئی۔ آخری بطلیموسی حکمران کے تحت
مصر کے محاصل سے ساڑھے بیس لاکھ پاؤنڈ آمدنی ہوتی تھی۔ اسپین کی فتح نے جو زمانہ
قدیم میں سونے کی کان کہلاتا تھا۔ اس بے شمار دولت میں مزید اضافہ کیا۔ اس صوبہ کے ہر
حصہ میں سونے، چاندی اور تانبے کی لاتعداد کانیں تھیں صرف ایک کان سے جو کارتھیجینیا
(CARTHAGINIA) کے قریب واقع تھی۔ تین لاکھ پاؤنڈ سالانہ کی چاندی
برآمد ہوتی تھی۔ آمدنی کے ان غیر معمولی ذرائع کے باوجود جب آگسٹس نے زمام حکومت
ہاتھ میں لی تو اسے آمدنی کے ناکافی ہونے کا شکوہ تھا۔ چنانچہ اس نے ابتدا ہی میں یہ خیال
ظاہر کیا کہ روما اور اطالیہ کو فوج اور نظم و نسق کے مصارف میں حصہ لینا چاہیئے۔ لیکن
اس ارادہ کی تکمیل میں اس نے تدریج اور احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ کسٹم کا محصول عائد
کرنے کے بعد اس نے چنگی کا ایک نیا محصول لگایا۔ اس کے بعد روما کے شہریوں کی شخصی
جائداد اور املاک پر ایک نیا محصول لگایا گیا۔ اسی زمانہ میں روما میں درآمد ہونے والے
سامان پر بھی محصول عائد کیا گیا۔ چنانچہ صوبوں سے جتنی اشیائے تکلف روم میں آتی تھیں
ان پر محصول لیا جاتا تھا۔ یہ محصول صوبہ جاتی تاجروں کو نہیں بلکہ بالواسطہ رومی شہریوں
کو دینا پڑتا تھا۔ پھر جب آگسٹس نے سلطنت کی مدافعت کے لئے ایک مستقل فوج کی ترتیب

تنظیم کی تو اس نے رعایا اور وراثت پر ایک نیا محصول عائد کیا جس کی شرح ۵ فیصد تھی چونکہ اس محصول کا دائرہ روم اور اطالیہ تک محدود نہ تھا بلکہ رومی شہریت سے مستفید ہونے والے تمام باشندے خواہ وہ سلطنت کے کسی حصہ میں سکونت پذیر ہوں اس کی ادائیگی کے ذمہ دار تھے اس لئے رومی شہریت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس محصول کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لوگوں کو اس محصول کی ادائیگی ناگوار نہیں تھی کیونکہ رومی شہریت کے حق سے مستفید ہونے کے باعث ان کے مراتب و اعزازات میں اضافہ ہونے کے علاوہ انہیں ملکی اور فوجی عہدوں کے حصول میں بھی آسانی ہوتی تھی۔ لیکن رومی شہریت کے اس خصوصی امتیاز کو کیرا کلا نے ختم کر دیا جبکہ ۲۱۲ء میں اس نے رومی شہریت کا حق عام کر کے صوبوں کے تمام باشندوں کو رومی شہری قرار دیا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب صوبوں کے باشندوں کو رومی شہریت میں کوئی خصوصی اعزاز و امتیاز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ سلطنت کا ہر باشندہ رومی شہری ہو گیا تھا۔ البتہ اس برائے نام اعزاز کے بدلہ میں ان کے محاصل اور مالی ذمہ داریوں میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور درحقیقت کیرا کلا کی نیت بھی یہی تھی کہ رومی شہریت کو عام کر کے صوبوں کے تمام باشندوں کو مزید محاصل کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے۔ اس کے علاوہ کیرا کلا نے رعایا اور ریاستوں پر دس فیصد کے بجائے بیس فیصد محصول لینا شروع کیا۔ جب صوبوں کے کل باشندے رومی شہری بن گئے تو انہیں بجا طور پر یہ توقع ہوئی کہ وہ ان تمام محاصل سے مستثنیٰ کر دیئے جائیں گے جو انہیں محکوم رعایا کی حیثیت سے ادا کرنے پڑتے تھے۔ لیکن کیرا کلا نے ان سے جدید اور قدیم دونوں محاصل وصول کئے۔

جب تک روم اور اطالیہ کو سلطنت کے قلب اور مرکز کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ حاصل تھا وہاں کے باشندوں میں ایک قومی جوش پایا جاتا تھا۔ صوبوں کے جو افراد رومی شہریت حاصل کر کے اطالیہ یا روم میں بس جاتے تھے۔ ان میں بھی اس قومی شعور کا گہرا اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ فوج کے بڑے بڑے عہدوں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد فائز تھے جو اپنے ملکی قوانین اور قومی ادب و ثقافت کی روایات سے نا آشنا نہ تھے اور جنہیں ندر یجاً

سول اور فوجی مناصب پر ترقی ملتی رہتی تھی۔ لیکن جب کیرا کلا نے رومی شہریت عام کردی تو تعلیم یافتہ اور مہذب اشخاص نے فوج کے مقابلہ میں وکالت اور عدالت کے پیشوں کو ترجیح دینی شروع کی یہاں تک کہ فوج کے پورے نظام پر سرحدی علاقوں کے کاشتکار اور وحشی اقوام کے افراد چھا گئے جنہیں نہ ملکی قوانین سے واقفیت تھی اور نہ روما کی قومی اور ثقافتی روایات سے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی وحشت و بربریت کے ساتھ سلطنت کی سرحدوں کو محفوظ رکھنے میں۔ بڑی جانفشانی اور بڑی جان نثاری سے کام لیا۔ لیکن شہنشاہوں کے عزل و نصب اور ملکی سیاسیات میں دخیل ہو جانے سے داخلی بدنظمی اور انتشار کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

داخلی کمزوریاں

تیسری صدی عیسوی میں سلطنت روما کے داخلی نظام کی کیفیت گبن (GIBBON) نے حسب ذیل طریقہ پر بیان کی ہے:۔

جب سے رومولس (ROMULUS) بانی روم نے چرواہوں کی چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ دریائے ٹائبر کے قریب چند پہاڑیوں کو اپنا مسکن قرار دیا تھا اس وقت سے اب تک دس صدیاں گزر چکی تھیں۔ رومی تاریخ کے پہلے چار سو سال میں رومیوں نے افلاس اور تنگی کی درسگاہ میں جنگ جوئی اور حکمرانی کی صفات پیدا کر لیں۔ ان خصوصیات کے باعث اور قسمت کی یاوری سے انہوں نے آئندہ تین سو سال کے عرصہ میں یورپ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک فتح کر لیے۔ آخری تین سو سال ظاہری ترقی اور حقیقی زوال کے ایام تھے۔ سپاہیوں قانون دانوں اور ماہرین سیاست کی یہ قوم اپنے عادات و افکار میں کسی طرح سلطنت کی دوسری قوموں سے ممتاز نہ تھی جن کی غلامانہ ذہنیت رومی شہریت اور رومی روایات آزادی کے باوجود اپنی جگہ جوں کی توں برقرار تھی۔ کرایہ کی ایک فوج جو سرحدی علاقوں کے باشندوں اور وحشی اقوام میں سے بھرتی کی جاتی تھی البتہ صحیح معنوں آزاد تھی۔ لیکن کبھی کبھی وہ اس آزادی کا بے جا فائدہ بھی اٹھا لیتی تھی۔ اسی فوج کے

ہنگامہ خیز انتخاب نے کبھی ایک شامی کبھی ایک قوطی (GOTHIC) اور کبھی ایک عرب کو روم کا شاہنشاہ بنا دیا۔

سلطنتِ روما کے حدود اب بھی بحر اطلانتک سے دجلہ تک اور دریائے رائن سے ڈینیوب تک وسیع تھے، ایک سطحی نظر رکھنے والا شخص اسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ فلپ اعرب (شہنشاہِ روم) کی حکومت اتنی ہی مستحکم اور طاقتور ہے جتنی ہیڈریان (HADRIAN) یا آگسٹس کی۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہری آثار و اشکال کے لحاظ سے ان دونوں زمانوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن سلطنت کی اصلی قوت ضعیف ہو چکی تھی۔ عیش و عشرت کی عادات اور ظالمانہ محاصل کے بارے لوگوں کے اندر محنت و جانفشانی اور ایثار و قربانی کا مادہ فنا کر دیا تھا۔ فوج کے نظم و ضبط کو جو اس عمارت کا واحد ستون تھا شہنشاہوں نے اپنے ذاتی اغراض کی خاطر طمع و لالچ اور دیگر مادی محرکات کے غیر معمولی اور بکثرت استعمال سے درہم برہم کر دیا تھا۔ سرحدوں کا استحکام جو قلعہ بندیوں پر نہیں بلکہ رومانی فوجی اسپرٹ پر موقوف تھا۔ رفتہ رفتہ کمزور ہو گیا اور زرخیز ترین صوبے وحشی اقوام کی لوٹ مار کے آماج گاہ بن گئے۔ کیونکہ ان اقوام کو سلطنت کے اندرونی ضعف کا پورا پورا احساس تھا۔

وحشی اقوام اور رومیوں کے عادات، اطوار اور طرزِ زندگی کا مقابلہ

ٹیسی ٹس (TACITUS) کے زمانہ میں جرمن پڑھنے لکھنے کے فن سے بالکل ناواقف تھے اس مورخ کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ میں جرمنوں کے ملک میں کوئی شہر نہیں پایا جاتا تھا ان کے چھوٹے چھوٹے مکان پتھر، اینٹ یا کھپروں کے بجائے مٹی کے بنے ہوتے تھے ملک میں اناج بہت کم مقدار میں پیدا ہوتا تھا اور باغبانی سے یہ لوگ بالکل ناآشنا تھے جرمنی کے جنگلی جانوروں سے بکثرت بھرے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں جانوروں کا شکار کر کے یہ لوگ اپنا پیٹ پالتے تھے۔ چاندی، سونے اور لوہے کے استعمال سے یہ لوگ بہت کم واقف تھے۔ ان کے ہتھیاروں میں لوہے کا جزو بالکل ناپید تھا۔ روما سے تجارتی تعلقات رکھنے کی وجہ سے دریائے رائن کے قریب بسنے والے جرمنوں میں سکوں کا رواج پایا جاتا تھا۔

لیکن اندرونِ ملک کے باشندے سکوں کے استعمال سے ناواقف تھے۔

جرمنی کے بیشتر حصوں میں ملک کا طرزِ حکومت جمہوری تھا اگرچہ ان کے جمہوری نظام کا کوئی لکھا ہوا دستور موجود نہ تھا اور نہ ان کے کوئی باقاعدہ ملکی قوانین تھے۔ قبائل کے جنگجو افراد کی ایک مجلس معینہ اوقات پہ جمع ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ناگہانی صورت حال میں بھی اس کا فوری انعقاد عمل میں آتا تھا۔ بڑے بڑے جرائم کی سزا اور مجسٹریٹوں کا انتخاب اسی مجلس کے تفویض تھا نیز جنگ اور صلح کے مسائل کا تصفیہ اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ بعض وقت اس قسم کے اہم مسائل پر فوجی سرداروں کی ایک علیحدہ مجلس میں قبل از قبل غور و خوض کے بعد تجاویز مرتب کر لی جاتی تھیں۔

جرمنوں کی عورتیں عفت اور پاکدامنی کا نمونہ تھیں۔ اُن میں تعدّدِ ازدواج کا رواج بہت کم تھا۔ صرف بڑے امراء اور سردار اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ طلاق قانوناً ممنوع نہ تھی لیکن عموماً سوسائٹی میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔ زنا کی سزا دینے میں ان کی بازاتیہ کی دولت، مرتبہ یا حسن کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ رومن مورّخ ٹیسی ٹس (TACITUS) رومی خواتین اور عام عورتوں کی بدچلنی کا وحشی جرمن عورتوں کی پاکدامنی اور عفت سے مقابلہ کر کے اظہارِ افسوس کرتا ہے۔

لباس کی تراش خراش اور چال ڈھال کی نزاکت سے انسانی احساسات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ پرتکلف دعوتیں، رقص و سرود کی شبینہ محفلیں اور شہوت افزا مناظر نسوانی کمزوریوں کے لئے ابتلاء و آزمائش کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔ وحشی جرمنوں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنی گھریلو مصروفیتوں اور اپنے عزبت و افلاس کے باعث ان خطرات سے محفوظ تھیں۔ لیکن جرمن اپنی عورتوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ان سے ہر اہم معاملہ میں مشورہ لیتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کے سینے دانشمندی اور تقدس کے مسکن و مولد ہیں۔

وحشی جرمنوں کے حملوں کے وقت ان کے خیموں میں عورتوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا اور یہ عورتیں لڑائی کی ہنگامہ خیزی اور تباہ کاری سے مطلق خائف نہیں ہوتی تھیں۔

رومیوں کی جنگی صلاحیت پر عیش و عشرت کی عادات کا اثر

رہے گئے استعمال سے تو میں سیم و زر کے وسائل پر قابو حاصل کر لیتی ہیں لیکن جرمنی کے وحشی قبائل ان دونوں کے استعمال سے نا آشنا تھے۔ جرمنی کے گھوڑے نہ تو حسن و جمال کے اعتبار سے ممتاز تھے اور نہ کثرت پیداوار کے اعتبار سے۔ نہ ہی جرمنوں کو شہسواری کے فن میں رومیوں کی سی مشق و مہارت حاصل تھی، پھر بھی جرمنی کے چند قبائل نے فن شہسواری میں نام پیدا کر لیا تھا اس طرح جرمنوں کی طاقت کا دارومدار ان کی پیدل فوج پر تھا نہ کہ گھوڑے سواروں پر" جب اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ رومی سپاہی ساز و سامان جنگ اور اسلحہ سے لیس ہوتے تھے باقاعدہ فوجی مشق و تربیت اور فن حرب کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کی قلعہ بندیاں نہایت مستحکم تھیں ان کے پاس فوجی گاڑیاں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھیں تو یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وحشی جرمن اپنی بے سروسامانی اور جنگی ناواقفیت کے باوجود رومی فوجوں کا میدان جنگ میں سامنا کرتے تھے۔ اصل میں ان دونوں حریفوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا اور رومیوں کے مقابلہ میں جرمن ایک منٹ بھی میدان جنگ میں نہیں ٹھہر سکتے تھے لیکن وسائل عیش کی کثرت اور آرام و راحت کی طلب نے رومیوں کی جسمانی اور ذہنی طاقتوں کو کمزور کر دیا تھا ان کی فوجوں میں نظم و ضبط کی کمی ہوتی جا رہی تھی۔ مزید برآں سرحدی علاقوں کے جرمن قبائل کو امدادی لشکر کی حیثیت سے فوجی تنظیم میں داخل کر کے رومیوں نے اپنے لیے خود ہی ایک بڑا خطرہ پیدا کر لیا تھا۔"

رومیوں اور وحشیوں کی جنگیں

عرب نژاد فلپ (PHILLIP) کے بعد ۲۵۰ء میں ڈی سی الیس (DECIUS) رومیوں کا شہنشاہ مقرر ہوا۔ اس نے چند ہی ماہ حکومت کی تھی کہ سرحد پر قوطیوں (GOTHS) کے ایک بہت بڑے حملہ کی خبر ملی۔ یہ پہلا موقع تھا جب رومیوں کی تاریخ میں قوطی قوم کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے بعد میں

روما کی طاقت کو پاش پاش کر کے اطالیہ، فرانس اور سپین پر اپنی حکومت قائم کی۔ ڈی سی ایس کو اطلاع ملی کہ سنوا (CNIVA) جو قوطیوں کا بادشاہ تھا ایک بڑی فوج کے ساتھ دریائے ڈینیوب کو پار کر چکا ہے اور صوبہ میسیا میں اس کی فوج نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ڈی سی ایس اس حملہ آور کے تعاقب میں ایک دشوار گزار اور پُرخطر مسلک سے گزرتا ہوا فلیپوپلس پہنچا جس کا قوطیوں نے محاصرہ کر لیا تھا جب اپنے خیال کے مطابق وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا جو قوطی فوج کے عقب سے بہت دور تھا تو قوطی فوجوں نے نے اسے گھیر لیا اور اس طرح پہلی مرتبہ ایک رومی شہنشاہ کو وحشیوں کے ہاتھوں سے بھاگ کھڑا ہونا پڑا۔ قوطیوں نے ایک طویل محاصرہ کے بعد فلیپوپلس پر قبضہ کر لیا اس شکست نے ڈی سی ایس کو رومی سلطنت کی کمزوریوں کا جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ اس نے غور و خوض کے بعد محسوس کیا کہ عوام الناس کی اخلاقی حالت کو درست کرنے اور رومی قوانین کا از سر نو احترام قائم کرنے سے ہی سلطنت کی حالت ٹھیک ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے محتسب (CENSOR) کے قدیم عہدہ کا احیا کیا اور اس عہدہ پر ویلیریان (VALERIAN) کا تقرر کیا۔ نیز اس نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ محتسب کے فیصلوں کو ملکی قانون کے مساوی درجہ دیا جائے گا۔ اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ دار بھی محتسب کی نگرانی سے آزاد نہ ہوں گے۔ ویلیریان کو اس عہدہ کے حصول کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ اتنی بھاری ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا اسے یقین تھا کہ رومیوں کی اخلاقی حالت تقریباً لا علاج ہو گئی ہے۔ ایک محتسب قومی اخلاق کے مزید زوال و خرابی کا دروازہ بند کر سکتا ہے۔ لیکن جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہوں اُنہیں رفع کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ سچ یہ ہے کہ قوطیوں کو زیر کرنا آسان لیکن عوام کے اخلاقی انحطاط کا مداوا کرنا ایک امر دشوار تھا، ڈی سی ایس کو اس آسان تر کام میں اپنی فوج اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا دوسرے کام کا کیا ذکر، قوطیوں کو رومی افواج نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ اُن کی فوج کا بہترین حصہ فلیپوپلس کے محاصرہ میں ضائع ہو چکا تھا۔ ان حالات میں ان کو اس بات پر رضامند کر لینا کوئی دشوار امر نہ تھا کہ بغیر لڑے بھڑے وہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ بشرطیکہ رومی

ان کے قیدیوں کو رہا کر دیتے اور مالِ غنیمت انھیں واپس کر دینے پر آمادہ ہو جاتے۔ لیکن
شاہنشاہ ڈیسی اَلیس کو اپنی فوجی قوت پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے صلح کی کوئی شرط
منظور نہیں کی۔ وحشی قوطیوں نے مجبور ہو کر شکست پر موت کو ترجیح دینا پسند کیا۔ اور
اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے، اول اول انھیں کچھ دور
پیچھے ہٹنا ہی پڑا اور ان کی کئی فوجوں کو رومی شہنشاہ کے ہاتھوں بڑی طرح فوجی
شکست اٹھانی پڑی۔ لیکن جب رومی فوج ان کا تعاقب کرتی ہوئی ایک دلدلی علاقہ میں
پہنچ گئی تو لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور قوطیوں نے پوری رومی فوج کے ٹکڑے ٹکڑے کر
ڈالے، یہاں تک کہ خود ڈیسی اَلیس بھی اس لڑائی میں جان سے مارا گیا۔ اس کی وفات
کے بعد اس کے لڑکے ہوسٹلی این اَس (HOSTILIANUS) کو بادشاہ بنا دیا گیا
لیکن چونکہ وہ کم عمر اور ناتجربہ کار تھا اس لئے گیلس کو ہم مرتبہ شہنشاہ قرار دے کر ملک
کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا گیا۔ اس شہنشاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ البسریا کے علاقے کے
تمام صوبوں کو فاتح قوطیوں کے حوالہ کر کے ان سے صلح کر لی۔ اس نے نہ صرف تمام مالِ غنیمت
اور مفتوحہ علاقہ قوطیوں کے ہاتھ میں رہنے دیا بلکہ بڑے بڑے ممتاز رومیوں کو جو جنگ میں قوطیوں
کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے، ان کے حوالے کر دینے پر رضامند ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس
نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ آئندہ سے رومی علاقوں پر تاخت و تاراج کا سلسلہ موقوف کر
دیں تو انہیں سونے کی شکل میں ایک بہت بڑی سالانہ رقم دی جایا کرے گی۔

روما کے جمہوری دور میں بڑے بڑے متمول بادشاہ جو روم کی حفاظت اور سرپرستی
کے طلبگار ہوتے رومی حکمرانوں کے ہاتھ سے نہایت ادنیٰ قسم کے تحفے قبول کرنے کو اپنے
لئے شرف و عزت کا باعث سمجھتے تھے۔ اس کے بعد جب رومی جمہوریت سلطنت میں
تبدیل ہو گئی اور دنیا بھر کی دولت و ثروت کھنچ کھنچ کر روم میں جمع ہونے لگی تو روم کی باج گزار
ریاستوں اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے اور ان پر رومی عظمت
کا سکہ جمانے کے لیے شہنشاہِ روم انھیں نہایت فیاضانہ مالی عطیات اور تحائف
دیا کرتے تھے۔ یہ فیاضانہ عطیات رومی حکومت کی دوست نوازی کا نتیجہ ہوتے تھے اور

کسی کے دل میں اس وقت یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ رومی سلطنت کسی خوف یا کمزوری کی بنا پر ان عطیات و وظائف کی تقسیم عمل میں لا رہی ہے۔ لیکن گیلس نے جو سالانہ رقم وحشی قوطیوں کو دینی منظور کی وہ علانیہ طور پر ایک ذلت آمیز خراج کی شکل رکھتی تھی۔ رومی ذہن ابھی تک ان باتوں کا عادی نہ تھا۔ اس لیے گیلس کے خلاف عوام میں ایک عام برہمی پیدا ہو گئی۔ حالانکہ اس نے یہ کام بدرجہ مجبوری اور ازراہ مصلحت شناسی کیا تھا۔ لیکن رومیوں میں اور زیادہ ناراضگی اس وقت پھیلی جب انھیں معلوم ہوا کہ اس قومی ذلت کے باوجود جو انہیں خراج کی صورت میں سہنی پڑی تھی ملک کا امن و اطمینان اب بھی وحشی جرمنوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ دنیا پر اب یہ راز کھل گیا تھا کہ روم دولت و ثروت کے اعتبار سے قوی لیکن فوجی قوت اور سیاسی استحکام کے نقطۂ نظر سے کمزور ہے۔ وحشیوں کے نئے نئے گروہ جن کی ہمتیں قوطیوں کی کامیابی سے اور زیادہ بڑھ گئی تھیں اور جو معاہدات کی پابندی سے آزاد تھے صوبوں کو تاخت و تاراج کرنے لگے یہاں تک کہ دارالسلطنت بھی ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہ تھا۔

۲۵۳ء تا ۲۶۳ء میں جبکہ ویلیریان اور اس کا نوجوان بیٹا گیلی نس روم کے حکمران تھے جرمنی کے مشرقی حصہ کے باشندے جو فرینک (FRANKS) کہلاتے تھے موجودہ علاقہ فرانس پر جو اس زمانہ میں گال کہلاتا تھا حملہ آور ہوئے ان لوگوں نے دریائے رائن کو پار کر کے نہ صرف فرانس بلکہ اسپین تک کو اپنے حملوں کا آماجگاہ بنا لیا۔ گیلی نس کے دور حکومت میں حملہ آور فرینک قوم سے اسپین کی سرزمین پر بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ پھر ان کا سیلاب اسپین سے نکل کر شمالی افریقہ کے علاقہ تک پھیل گیا۔

ویلیریان اور گیلی نس کے زمانہ میں جرمنوں اور سرماطیون نے دریائے ڈینیوب کی سرحدوں پر مسلسل حملے کئے لیکن رومیوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کیونکہ جن صوبوں میں لڑائی کا بازار گرم تھا۔ ان کے باشندے بڑے سخت جان اور رومی فوج کے دست و بازو تھے۔ اگرچہ وحشی جرمن کبھی کبھی مقدونیہ اور اطالیہ کی

سرحدوں تک پہنچ جاتے تھے لیکن انہیں وہاں سے مار بھگا دیا جاتا۔ لیکن قوطیون نے اب
رومی علاقہ کے ایک اور حصہ پر اپنا وار شروع کیا۔ اس عرصہ میں یہ قوم یوکرین UKRAINE
کے علاقہ میں منتقل ہو گئی تھی، یہاں سے انھوں نے ایشیائے کوچک کے رومی صوبہ پر حملے
کرنے شروع کیے۔ ان کا ایک بہت بڑا بیڑا تریزان (TREBEIZOND) کی مشہور
بندرگاہ پر حملہ آور ہوا۔ اس شہر کی مدافعتی فوج کو عیش و نشاط میں مصروف پا کر قوطی
شہر پناہ کی دیواروں پر چڑھ گئے اور رات کی خاموشی میں شہر کے اندر داخل ہو گئے۔
انھوں نے ہزاروں انسانوں کو تہ تیغ کر دیا، ہزاروں لاکھوں کو قیدی بنایا اور لاتعداد
مال غنیمت لے کر نہایت کامیابی سے اپنے وطن واپس گئے۔ اس کے بعد قوطیون کا ایک
اور حملہ زیادہ فوجوں اور زیادہ ساز و سامان کے ساتھ ایک نئے رُخ سے شروع ہوا
اب کی مرتبہ ایشیاے کوچک کے بجائے یونان ان کی تاخت و تاراج کا مرکز بنا
چالسڈن (CHALCEDON) کی قلعہ بند رومی افواج نے جو تعداد اور ساز
و سامان میں وحشی حملہ آوروں سے بہت بڑھ چڑھ کر تھیں بغیر لڑے بھڑے شہر کو قوطیون
کے حوالہ کر دیا۔ اگر یہاں پر قوطیون سے جم کر مقابلہ کیا جاتا تو یونان اور اطالیہ کے دوسرے
شہروں کو ان کے حملہ کا زور سہنا پڑتا تھیبس۔ آرگوس۔ کارنتھ اور اسپارٹا یکے بعد
دیگرے قوطیون کے قیامت خیز حملوں کا شکار ہوئے لیکن ان کی مدافعت کا کوئی معقول
انتظام نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ اب قوطی اطالیہ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اس وقت گیلی نیس
عیش و نشاط سے چونکا اور اس نے خود میدان جنگ میں آ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا
شہنشاہ کی موجودگی نے حملہ آوروں پر اچھا اثر ڈالا اور ان کا جوش کسی قدر ٹھنڈا
پڑ گیا۔ نالوبیٹس (NAULOBATUS) نے جو قوم (HERULI) کا سردار
تھا رومیوں کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے بہت سے ہم قوم افراد کے ساتھ اس نے
رومی سلطنت کی ملازمت اختیار کی۔ اس کو رومی قونصل (CONSUL) کا مرتبہ
دے کر اعزاز دیا گیا اور روما کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جبکہ وحشی اقوام کے ایک فرد
کو رومیوں کا ہم مرتبہ تسلیم کر لینا ضروری محسوس ہوا۔

عین اس زمانہ میں جبکہ رومی سلطنت پر ہر طرف آثار زوال طاری تھے، ایرانی سلطنت کی طاقت و قوت بڑھتی جا رہی تھی۔ شاپور نے جو ایک زبردست اور طاقتور ایرانی حکمران گزرا ہے آرمینیا کی ریاست پر قبضہ کر لیا جو رومی حکومت کی باجگزار تھی۔ ستائیس سال تک رومیوں کی حلیف ریاست ایرانیوں کی محکوم رہی۔ اس کامیابی نے شاپور کی ہمت کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ اس نے نصیبین اور Carrhae کی طاقتور رومی افواج سے ہتھیار رکھوا کر انھیں ایرانیوں کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا اور دریائے فرات کے دونوں جانب رومیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ شہنشاہ ویلیریان کو رومیوں کی پیہم شکستوں نے بالآخر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خود میدان جنگ میں ایرانیوں کے مقابلہ پر آئے۔ چنانچہ کبرسنی کے باوجود اس نے دریائے فرات پار کر کے ایرانیوں پر پیش قدمی کی لیکن الرّوحہ کے مقام پر شاپور نے اس کو ایک سخت شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ اس عظیم الشان فتح نے شاپور کے حوصلے اور زیادہ بلند کر دیئے۔ اس نے رومی سلطنت کی حکمرانی کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو بالکل اس کی مرضی پر چلتا تھا چنانچہ سائیریڈیز (CYRIADES) کو جو انطاکیہ کا ایک غیر معروف باشندہ تھا ویلیریان کا جانشین مقرر کیا گیا اور رومی فوج کو چار و ناچار اس کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔

ویلیریان کی موت کے بعد رومی تخت کے کم سے کم تیس دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے اس کے بیٹے گیلی ینس کا مقابلہ کر کے حصول سلطنت کی کوشش کی۔ یہ حریف دعویدار مرکز سلطنت سے نہیں بلکہ صوبوں سے اٹھے تھے۔ چنانچہ مشرق میں (CYRIADES) (MACRIANUS) (BALISTA) اُذینہ (ODENATHUS)، زینب (ZENOBIA) فرانس اور مغربی صوبوں میں (LOLLIANUS) (VICTORINUS) اس کی ماں وکٹوریہ۔ (MARIUS) اور (TETRICUS) ڈینیوب کے علاقہ میں INGENUUS (REGILLIANUS) اور (AURELIOS) اسی طرح دوسرے صوبوں میں دیگر اشخاص

نے ذبحوں کی تائید سے اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا۔ ان میں سے اکثر دعویدار ایسے تھے جنہیں سلطنت کی آرزو نہ تھی محض اپنی جان اور عزت کے خوف سے وہ اس جرأت مندانہ اقدام پر مجبور ہوئے تھے۔ تخت سلطنت کا ایک دعویدار بھی ایسا نہ تھا جو اپنی فطری موت سے مرا ہو یا جسے زندگی میں ایک روز بھی چین نصیب ہوا ہو جونہیں کوئی شخص مرتبہ حکومت سے سرفراز ہوتا اس کے حامیوں اور مددگاروں کے دل میں وہی امنگیں اور حوصلے پیدا ہو جاتے جو اس کی اپنی باغیانہ کارروائیوں کے محرک تھے اور بالآخر وہ گھریلو سازشوں فوجی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو کر جلد ہی کسی قاتل کے حملہ کا شکار ہو جاتا۔

شہنشاہ کلاڈیس (۲۶۸ء) نے اپنے زمانۂ حکومت میں وحشی قبائل کی سرکوبی کر کے ان کے اقدامات کو روک دیا۔ لیکن آریلین (AURELIAN) کے زمانہ میں انھوں نے پھر سر اٹھایا۔ آریلین نے ان کا سخت اور مردانہ وار مقابلہ کیا اور طرفین تھک کر بالآخر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ قوطیوں نے وعدہ کیا کہ اپنی فوج میں سے رومی افواج کو دو ہزار امدادی سپاہی دینگے بشرطیکہ انھیں پُرامن طریقہ سے اپنے ملک میں مراجعت کی اجازت دی جائے۔ آریلین نے صوبہ ڈیشیا سے اپنی فوجیں ہٹا کر اس علاقہ کو قوطیوں کے لیئے خالی کر دیا۔ اب ڈیشیا ایک خود مختار صوبہ بن گیا جو رومی علاقہ اور وحشی قبائل کے مابین حدِ فاصل تھا۔ یہاں کے رومی باشندوں نے قوطیوں اور دیگر وحشی اقوام کی غلامی کو بطیب خاطر منظور کیا۔ انھوں نے اپنے نئے فاتحین یعنی قوطیوں کو زراعت۔ تجارت اور تمدن کے دیگر علوم و فنون سے آشنا کیا۔ ڈیشیا اور رومی سلطنت کے درمیان تجارتی تعلقات بڑھتے گئے اور یہ خود مختار صوبہ شمالی جرمنی کے وحشی قبائل کی راہ میں ایک دیوار آہن کی طرح حائل ہو گیا۔ کیونکہ جرمنی کے جن وحشی قبائل نے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے فائدہ اسی میں محسوس کیا کہ رومیوں کے ساتھ مل کر سرحد پار کے وحشی قبائل کے خلاف اس صوبہ کی حفاظت کریں۔ بات یہ تھی کہ رومیوں سے ان کے تجارتی اور

معاشی مفادات وابستہ تھے اس لئے ان قوطی فاتحین نے نئے حملہ آوروں کے مقابلہ میں صوبہ ڈیشیا کی مدافعت کے لئے بڑی جانفشانی سے کام کیا۔

آریلین کی وفات کے بعد وحشی اقوام کا سیلاب سلطنت روما کی طرف پھر بڑھنا شروع ہوا لیکن پروبس (۲۷۶ء) نے اپنے چھ سالہ دور حکومت میں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر کے رومی سرحدات کو پھر محفوظ کر دیا۔ اس شہنشاہ نے جرمنی کے وحشی قبائل کو پیہم شکستیں دے کر انھیں رومیوں سے دب کر صلح کرنے پر مجبور کیا۔ شرائط صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ وحشی قبائل ہر سال اپنے سولہ ہزار تندرست اور مضبوط نوجوان رومی افواج میں بھرتی کریں۔ شہنشاہ ان غیر مہذب مگر طاقتور رنگروٹوں کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کی ٹکڑیوں میں سلطنت کے مختلف حصوں کی رومی افواج میں شریک کر دیتا اور انھیں کسی ایک مقام پر جمع نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ رومی سلطنت کو جو فوجی امداد جرمن وحشی قبائل کی بدولت حاصل ہو رہی ہے اس کا رومی عوام کو احساس نہ ہونا چاہیے ان قوموں کی امداد اب سلطنت روما کے لئے ضروری ہو گئی تھی، اطالیہ اور سلطنت کے دوسرے اندرونی علاقوں کی آبادی عیش و تنعم کی زندگی سے اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس کی طاقت پر بھروسہ کرنا ناممکن تھا۔ ڈینیوب اور رائن کی سرحدوں کے سخت جان باشندے اب بھی وہ دل و دماغ پیدا کرتے تھے جو میدان جنگ کی صبر آزما تکالیف کو بآسانی برداشت کر سکتے تھے لیکن لڑائیوں کے ایک طویل طویل سلسلہ سے ان علاقوں کی آبادی بہت گھٹ گئی تھی۔ زراعت اور کھیتی باڑی کی بربادی اور نکاح و ازدواج کی کمی نے نہ صرف زمانہ موجودہ کی طاقت کے وسائل بند کر دیئے تھے۔ بلکہ آئندہ کی اُمید بھی منقطع کر دی تھی۔ پروبس کا یہ اقدام بڑا دانشمندانہ تھا کہ اس نے رومی سرحدوں کی حفاظت کے لئے وحشی جرمن قبائل کی نوآبادیاں قائم کیں اور ان کے لئے اراضی، آلات زراعت اور مویشیوں کی فراہمی کا انتظام کیا۔ لیکن پروبس کی اکثر توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ وحشی قوموں کے افراد زراعت و فلاحت کی صبر آزمائی سے گھبرا اٹھتے تھے۔ ان کے آزاد منش طبائع اکثر اوقات انھیں مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف آمادہ بغاوت کر دیتے تھے جن سے

نہ صرف انھیں خود نقصان ہوتا بلکہ سلطنت میں بھی ضعف پیدا ہوتا۔

ڈائیوک لیشن DIOCLETIAN کے زمانہ میں رومی سلطنت نے جو نئی وضع اختیار کی اس کے بارے میں ایک انگریز مصنف جان ۔ بی ۔ فرتھ اپنی کتاب قسطنطین اعظم میں لکھتا ہے :۔

" ڈائیوک لیشن نے رومانی طرز حکومت میں ایک بڑا انقلاب یہ پیدا کیا کہ اس کو بالکل مشرقی رنگ میں رنگ دیا ۔ ہر قسم کے شاہانہ تکلفات اور خسروانی جاہ و حشم کے سامان جو مشرقی درباروں سے مخصوص تھے اور جن کو رومانی مذاق قبول نہ کرتا تھا اختیار کر لیے اب یہ رومانی حکمران مشرق کا ایک تاجدار بن گیا ۔ جواہرات سے مرصع زرق برق لباس پہنتا تھا جو لوگ اس کے سامنے آتے وہ فوجی سلام نہ کرتے تھے بلکہ گھٹنے ٹیک کر سر جھکاتے ہوئے آگے بڑھتے تھے ۔ اب فوجی حکام ہر وقت گرد و پیش نہ رہتے تھے بلکہ محل کے متعلقین اور ملازمین کا ہجوم رہتا تھا ۔ یہ کہنا شاید درست نہ ہو کہ یہ انقلاب محض ظاہر پرستی کے شوق نے پیدا کیا تھا یا ایک کم حوصلہ طبیعت رکھنے کی وجہ سے ظاہر ہوا تھا جو رسمی باتوں میں نمائش اور طمطراق پسند کرتی ہے کیونکہ ڈائیوک لیشن اس پایہ کا آدمی تھا کہ اس کی طبیعت کو ایسی کمزوریوں سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے ۔ ہمارے نزدیک اس انقلاب کی بڑی وجہ غالبًا یہ تھی کہ خود قوم نے اپنے قدیم استحقاق سے کہ وہ ایک آزاد اور بذات خود حکمران قوم کہلائی جائے دستبرداری اختیار کر لی اور غلام بننے کے لئے تیار ہو گئی ۔ شہنشاہ گیلی نیوکس نے جس وقت سنات کے جملہ متعلقین کو فوجی خدمات و اعزازات سے محروم کر دیا تو مجلس نے دم نہ مارا اور جب ایسے ہی مضمون کا فرمان جاری ہوا تو اراکین مجلس نے اس کو بلے چون و چرا تسلیم کر لیا ۔"

گزشتہ صفحات میں ہم نے رومی سلطنت کے دور زوال کے کچھ حالات بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی سیرت کی وہ کون سی کمزوریاں تھیں جو اس عظیم الشان سلطنت کے ضعف و شکست کا باعث ہوئیں ۔ ساتھ ہی یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ رومیوں کی ایک بڑی عمدہ صفت ان کی وسیع القلبی و عالی ظرفی تھی ، ان کا اجتماعی مزاج

قومی اور نسلی تعصبات سے بالکل بیگانہ تھا۔ اس اہم خصوصیت کے باعث ان کی سلطنت کو عرصۂ دراز تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ انہوں نے اپنی عظیم الشان سلطنت میں محکوم اقوام کو مساوی سیاسی اور تمدنی حقوق عطا کئے۔ یہاں تک کہ ان قوموں کے ممتاز اور قابل افراد کو انہوں نے رومی تخت و تاج سے بھی سرفراز کیا جس کی وجہ سے رومی سلطنت کو ہر نسل اور ہر قوم کے بہترین افراد کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا اور یہی سبب تھا کہ رومی سلطنت اندرونی ضعف و انتشار کے باوجود اتنے طویل عرصہ تک دنیا پہ غالب رہی۔ رومی سلطنت کے اس مخصوص پہلو پہ تبصرہ کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے:۔

"رومی سلطنت کے مختلف صوبوں میں رفتہ رفتہ ایک نئی رومی قوم وجود میں آ گئی۔ یہ اس طرح ہوا کہ اول تو رومیوں نے مختلف صوبوں میں اپنی بہت سی نوآبادیاں قائم کیں۔ دوسرے انہوں نے صوبوں کے اصلی باشندوں میں سے وفادار اور مستحق اشخاص کو رومی شہریت کے حقوق عطا کئے۔ علاقہ گال (فرانس) کے باشندے جنہوں نے جولیس سیزر کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا انہیں کے پوتوں اور پڑپوتوں نے رومی افواج کی قیادت سنبھال لی۔ صوبوں کے حاکم بنائے گئے اور رومی سینیٹ کی رکنیت سے سرفراز کیے گیے۔ اس طرح مفتوح اقوام آپس کے اختلاط سے ایک متحدہ قوم بن گئیں۔ انہوں نے اپنی آزادی اور خود مختاری سے نہ صرف دستبرداری حاصل کی۔ بلکہ اس کی بازیابی کی تمنا بھی ان کے دلوں سے مٹ گئی۔ رومی قومیت سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی اب ان پہ شاق گذرتا تھا۔"

مغربی تہذیب

مغرب کی عظیم الشان تہذیب جس نے گذشتہ تین سو سال میں مشرقی ممالک پہ اپنا سکہ جمایا اور ان ملکوں کے خیالات و معتقدات ۔ طرزِ رہائش اور طریقِ حکومت پہ گہرے اثرات مترتب کئے ۱۹۱۴ء کے بعد سے مسلسل رو بہ انحطاط ہے ۔ مشرقِ بعید میں چین کی سرزمین سے مغربی ممالک بالکل بے دخل ہو چکے ہیں ۔ ملایا اور ہند چینی میں مغربی ملوکیت کے خلاف عوام کی کشمکش اور جد و جہد جاری ہے ۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ولندیزی طاقت کو چار و ناچار اپنا اقتدار انڈونیشیا سے اٹھا لینا پڑا ۔ برما ۔ ہندوستان اور پاکستان سے انگریزوں نے خود ہی دستبرداری اختیار کر لی اور اب ان ممالک سے انگریزی اور امریکی اثرات کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو رہا ہے ۔ مشرقِ وسطیٰ میں ایران اور مصر مغربی طاقتوں کے مقابلہ میں اپنی آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں اور سارے عرب ممالک میں مغربی ملوکیت کے خلاف ایک عام بیزاری پیدا ہو گئی ہے یہ حالات بتاتے ہیں کہ مغربی تہذیب جس کی نمائندگی فرانس ۔ انگلستان اور امریکہ کر رہے ہیں اب دنیا سے رخصت ہو رہی ہے ۔ معین طور سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے خاتمہ میں کتنا عرصہ لگے گا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی اقوام اب اپنی طاقت اور عروج کے نصف النہار سے گزر کر پوری سرعت کے ساتھ آمادہ زوال ہیں ۔

مغربی تہذیب کے زوال و انحطاط سے بحث کرنے میں ایک عام غلطی یہ کی جاتی ہے کہ مغرب کے مختلف ممالک کو الگ الگ کر کے ہر ایک ملک کی تاریخ پر جداگانہ نظر ڈالی جاتی ہے ۔ حالانکہ فرانس ، انگلستان ، ہالینڈ ، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک ایک ہی تہذیب کی مختلف شاخیں ہیں اور ان کی تاریخ ایک بین الاقوامی تمدن کی مسلسل داستان ہے ۔ اس لئے تاریخ کے فلسفی کو ان ممالک پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنی چاہیئے اور انہیں ایک ہی تہذیب کے نمائندوں کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے ۔ اسی نقطہ نظر کے تحت ہم

فرانس کی شکست و بربادی کے حالات قلمبند کرتے ہیں ۔ اس کے بعد امریکہ اور انگلستان کی تاریخ سے جستہ جستہ واقعات پیش کرینگے ۔ بحیثیت مجموعی ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ ان سب ممالک میں انحطاط اور زوال کا جو عمل جاری ہے اس کے بنیادی اسباب رومی تہذیب کے زوال کے اسباب سے مختلف نہیں ہیں، اور قرآن نے اقوام کے زوال کی جو مشترک خصوصیات بیان کی ہیں ۔ ان کا اطلاق ان دونوں تہذیبوں پر کیا جاسکتا ہے ۔

(الف) فرانس

فرانس کی اجداد پرستی اور تقلیدی روش

فرانس جیسی قوم جس نے یورپ میں جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی عقلی آزادی اور اجتہادی قوت سے محروم ہو کر کس طرح آباپرستی اور تقلید اجداد میں گرفتار ہوگئی اور اس طرز عمل کے سیاسی اثرات کیا ہوئے اس کے متعلق (PIERRE MAILLAUD) اپنی کتاب "فرانس" میں لکھتا ہے :-

" پرولتاریہ (مزدور طبقہ) کے مسئلہ کو مختلف حکومتوں نے مختلف طریقوں سے حل کیا ہے ۔ فرانس میں صنعتی ترقی انگلستان اور جرمنی کے مقابلہ میں زیادہ تدریجی اور سست رفتار تھی ۔ مزدوروں کی انجمنوں کے پھیلاؤ اور وسعت کے باوجود فرانسیسی حکومت نے اس معاشی اور سماجی مسئلہ سے نبٹنے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں کی ۔ مزید خرابی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ فرانس میں مزدوروں کی انجمنیں اپنے اثر اور تعداد رکنیت کے اعتبار سے اتنی قوی نہ تھیں جتنی انگلستان کی انجمنیں ۔ جنگ عظیم کے بعد بھی فرانس کے بیشتر صنعتی ادارے مزدوروں کی اُجرتوں کا تعین کرنے میں مروجہ معاشی حالات کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے ۔

یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی قوم جس نے قدیم جاگیری نظام کو تبدیل کرنے میں پہل کی تھی، وہی اب معاشی اور سماجی اصلاح کے کام میں سب سے پیچھے تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی جو دستوری جمہوریت قائم کرنے میں کئی بار ناکامی اٹھا چکے تھے۔ جنگِ عظیم کے بعد بھی انھیں روایات پر زندگی بسر کر رہے تھے جو ان کے جمہوری انقلاب کی پیداوار تھیں وہ سمجھتے تھے کہ اس انقلاب (انقلاب فرانس) کے اصولوں میں تمام جدید مسائل کا حل موجود ہے یہ خیال کر کے کہ انسان کی آزادی اور مساوات کا اعلان کیا جا چکا ہے، خاندانی اور موروثی حقوق و مراعات کا وجود مٹایا جا چکا ہے، قدیم پابندیاں اور غلامانہ سماجی بیڑیاں کاٹی جا چکی ہیں۔ قومی زندگی میں ایسے قوانین کا نفاذ عمل میں آ چکا ہے جو بلا استثناء ہر شہری کے لئے واجب الاطاعت ہیں۔ ہر عاقل و بالغ کو حق رائے دہی مل چکا ہے اور تعلیم سب کے لئے مفت ہو گئی ہے، انقلاب فرانس کے حامیوں اور وارثوں نے قدرتاً اس کی پیدا کردہ روایات کو اپنے جدید مسائل کے لئے بھی کافی سمجھا اور یہ بھول گئے کہ تازہ مسائل کی نوعیت انقلاب فرانس کے مسائل سے مختلف ہے۔ اس انقلاب کے وارث اور حامی ہر پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ فرانس کی تمام سیاسی پارٹیاں خواہ وہ قدامت پسندوں کی ہوں، اعتدال پسندوں کی یا سوشلسٹوں کی اپنے سیاسی پروگرام اور اعلانات میں انقلاب فرانس کے اصولوں سے استشہاد و استدلال کرتی تھیں اور ان کی روش جدید مسائل حیات کے بارے میں قدامت پسندانہ تھی، کیونکہ انقلاب فرانس کے اصول اٹھارہویں صدی کے لئے کتنے ہی مفید ہوں بیسویں صدی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ناکافی تھے۔"

فرانس میں طبقاتی کشمکش

بیسویں صدی میں فرانس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کی آبادی دو بڑے حصوں میں منقسم تھی جن کے مفادات ایک دوسرے سے بالکل جدا بلکہ متصادم تھے۔ یعنی شہری آبادی اور دیہی (RURAL) آبادی۔ فرانسیسی پارلیمنٹ

میں ایک بھی ایسی پارٹی نہ تھی جو دیہی آبادی یعنی کسانوں کے مفاد کی حمایت کرتی۔ فرانس کو دو معاشی مسائل کا حل دریافت کرنا ضروری تھا۔ پہلا مسئلہ صنعتی مزدوروں کا تھا جن کے حقوق کا کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ دوسرا مسئلہ دیہی کسانوں کا تھا جنکا مفاد قوم کے دوسرے طبقوں سے متصادم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیمتوں کے تعین میں پیداکنندگان (PRODUCERS) اور صارفین (CONSUMERS) کے مفاد ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ برسر اقتدار سیاسی جماعتوں کی حکومتیں ان مسائل سے عہدہ برا ہونے میں ناکام رہیں۔ ان کے فیصلوں سے اگر ایک گروہ راضی اور مطمئن ہوجاتا تو دوسرے گروہ میں ناراضگی اور برہمی پیدا ہوجاتی۔ کیونکہ یہ جماعتیں مسائل کو ان کی جڑ سے حل کرنے کے بجائے سطحی اور ظاہری پہلوؤں سے حل کرنا چاہتی تھیں اور بنیادی خرابیوں کو دیکھنے کے بجائے اوپر سے لیپ پوت کر کے معاملات کو درست کرنے کی فکر میں رہتی تھیں۔

فرانسیسیوں کی بے عقیدگی

رکٹ (ROQUETTE) ہناؤ (HANAU) اور اسٹاوسکی (STAVISKY) کے شرمناک واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل فرانس بالکل بے عقیدہ ہوگئے تھے اور ان کی نظر میں اخلاقی اور معاشرتی جرائم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ افسوس کی بات یہ نہ تھی کہ بعض مجرمین پاداش جرم میں مبتلا تھے۔ بلکہ یہ کہ عوام الناس عام طور پر محسوس کرتے تھے کہ جو لوگ ان مجرموں کو سزائیں دے رہے ہیں انہیں خود مجرموں کے کٹہرے میں جگہ ملنی چاہئے۔ فرانس میں پارلیمانی اداروں (PARLIAMENTARY INSTITUTIONS) کا کوئی احترام باقی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ ان کے ذریعہ سے ملک کے معاشی مسائل کے حل کرنے کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جب عوام کا اپنے نمائندوں پر اعتماد باقی نہیں رہا تو قوم کے مالدار اور بااثر بداعمال اشخاص کے لئے آسان ہوگیا کہ وہ اس عام غفلت و بے اعتنائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی کوشش کریں۔ جعل و فریب کے ان واقعات سے اتنی بڑی خرابیاں نہ پیدا ہوتیں۔ اگر فرانس کی

قومی زندگی کی بنیادیں پہلے ہی ہل نہ چکی ہوتیں کسی اصول وعقیدہ پر افراد قوم کا ایمان نہ رکھنا ہر اخلاقی تعلیم اور روحانی نظریہ کو مشککانہ (Sceptical) نظروں سے دیکھنا اور اس پر باندازِ تمسخر معترض رہنا نیز زندگی کے بارے میں کوئی مستقل اور مستحکم نقطۂ نظر نہ رکھنا یہ امراض اخلاقی جرائم اور سیاسی فریب ہی سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک تھے کیونکہ اس بے عقیدگی اور اخلاقی کھوکھلے پن کی وجہ سے مجرموں کو یہ یقین ہو جاتا تھا کہ ان پر احتساب اور گرفت کرنے میں رائے عامہ کوئی قوی دباؤ نہیں ڈالے گی۔ ہر قوم میں اسٹاوسکی (STAVISKY) پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک زندہ اور بیدار قوم ایسے اشخاص کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔"

فرانس میں جمہوریت کا غلط ارتقاء

فرانس کے لوگوں کو انقلاب فرانس پر بڑا ناز تھا لیکن اس انقلاب کے بارے میں ایک دردناک حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے امراء اور جاگیردار طبقہ نے اس کے اصولوں کو بطیب خاطر قبول نہیں کیا کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اپنی خصوصی مراعات سے محروم ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت اور جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد ان طبقات نے جن کو انقلاب فرانس سے نقصان پہنچا تھا بیٹے جمہوری نظام کو مٹانے یا کمزور کرنے کی بڑی سخت کوششیں کیں۔ اسی نقطۂ نظر سے فرانسیسی جمہوریت کے نشو و ارتقاء کے حالات بیان کرتے ہوئے این ڈی پرٹ (N. D. PRITT) اپنی کتاب زوال جمہوریہ فرانس (THE FALL OF THE FRENCH REPUBLIC) میں لکھتا ہے :-

" فرانسیسی جمہوریت ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے واقعات سے معرض ظہور میں آئی تھی، یعنی فرانس اور پرشیا (PRUSSIA) کی جنگ سے شہنشاہ لوئی نپولین کو جس بات نے پرشیا سے جنگ پر آمادہ کیا وہ یہ تھی کہ فرانس کا مزدور طبقہ اور عام لوگ اس کے خلاف تھے۔ یہ اندرونی کمزوری جس نے سلطنت کو مبتلائے جنگ کر دیا اسکی شکست

و بربادی کا موجب بھی ہوئی۔ دوسری جمہوریت کے لیڈر بیرونی دشمن سے دل کھول کر لڑتے ہوئے اس لئے گھبراتے تھے کہ انھیں اندرون ملک اپنے مخالفین یعنی مزدوروں اور عوام کی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا اور اس اندرونی دشمن کا خوف ان پر جرمنوں کے خوف سے زیادہ غالب تھا۔

فرانس اور پرشیا کی جنگ میں فرانس کو بُری طرح شکست ہوئی۔ دوسری جمہوریت ایک گھروندے کی طرح بیٹھ گئی اور شہنشاہ لوئی نپولین کو انگلستان میں پناہ لینی پڑی۔ جرمنوں سے عارضی صلح کی بات چیت تھیرس (THEIRS) نے کی جو ایک منتخب کردہ مجلس موسومہ کمیون (COMMUNE) کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس طرح عارضی صلح کے چند ہفتوں کے بعد فرانس میں دو حکومتیں کام کر رہی تھیں۔ لیکن آخرکار ایک وحشیانہ خانہ جنگی کے بعد تھیرس (THEIERS) کی حکومت نے پیرس کمیون (PARIS COMMUNE) کا استیصال کر دیا۔ متمول طبقات کی نمائندہ تھیرس کی حکومت نے مزدوروں سے بڑا سخت انتقام لیا اور تقریباً تیس ہزار مزدوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن اپنی سترہ روزہ عمر کے دوران میں پیرس کمیون نے ایک نئے طرزِ حکومت کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا تھا جس کو زمانہ آئندہ کے تمام انقلابیوں نے بطور نمونہ پیشِ نظر رکھا۔

پیرس کمیون کے استیصال کے بعد کئی سال تک فرانس کے اربابِ حل و عقد یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ملک میں کس قسم کا نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔ جب چیمبر (مجلس) کا انتخاب عمل میں آیا تھا اس کی اکثریت رجعت پسندوں اور شاہی کے حامیوں پر مشتمل تھی لیکن ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ علانیہ شاہی طرزِ حکومت کو از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کرے۔ رجعت پسند ارکانِ مجلس اور بادشاہت کے حامیوں کو معلوم تھا کہ اگرچہ عوام کی تحریکِ آزادی کو بُری طرح پامال کر دیا گیا ہے لیکن وہ بادشاہت کے دوبارہ قیام کو گوارا نہیں کرینگے اور اگر اس کی کوشش کی گئی تو عوامی تحریک کا عرصہ دراز تک مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انقلابی تحریک پھر ایک مرتبہ زور پکڑ جائے۔ اس لئے ۱۸۷۵ء میں

فرانس کے ارباب حل وعقد نے یہ فیصلہ کیا کہ جمہوریت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ لیکن جن لوگوں نے یہ تصفیہ کیا وہ اسے ایک عارضی انتظام سمجھتے تھے اور موقع کے منتظر رہتے کہ سازگار حالات پیدا ہونے پر بادشاہت کا قیام پھر ایک بار عمل میں لایا جائے۔ فرانس کے صدر حکومت مارشل میک موہن نے شاہی حکومت کیلئے حالات سازگار بنانے کی جان توڑ کوشش کی اور جب ۱۸۷۸ء میں اس کوشکست ہوئی تب بھی بادشاہت پسندوں نے جمہوری حکومت کو ایک ناگزیر برائی کے طور پہ قبول کرنا گوارا کیا اور مسلسل اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی نہ کسی طرح شاہی طرز حکومت کے لئے راستہ ہموار کریں۔

اس طرح فرانس کی تیسری جمہوریت جس کا خاتمہ ۱۹۴۰ء میں جرمنوں کے ہاتھوں عمل میں آیا ایک مصالحت (COMPROMISE) کا نتیجہ تھی۔ فرانس کے مالدار حکمران طبقہ نے اس مصالحت کے ذریعہ ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا جس میں انہیں اپنی دولت اور اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے کے بیش از بیش مواقع موجود تھے اور جس میں عوام کے انقلابی جذبات کے بھڑک اٹھنے کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیا گیا تھا۔ اسی آخرالذکر خطرہ کو رفع کرنے کے لئے شاہی طرز حکومت کے بجائے جمہوری طرز حکومت اختیار کیا گیا تھا اور زمانہ مابعد میں بھی اسی خطرہ کے پیش نظر کئی جمہوری اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ لیکن مالدار اور متمول طبقوں کی غیر مرئی اور غیر محسوس حکومت اس جمہوری لباس اور ان جمہوری اشکال ومراسم کے باوجود پوری طاقت کے ساتھ قائم رہی۔ فرانس کی نئی نسل جمہوری نظام حکومت کے علاوہ اور کسی طرز حکومت سے ناواقف تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرانس کی جمہوریت ایک ایسی عیاری کا نتیجہ تھی جس میں عوام کو جمہوری اصطلاحات اور ادارہ جات کے پردہ میں مالدار اور متمول طبقات کی حکمرانی پر رضامند کر لیا گیا۔ چنانچہ ملک کی اصلی معاشی اور سیاسی طاقت اب بھی انھیں طبقات کے ہاتھ میں تھی جو شاہی حکومت کے زمانہ میں اقتدار اور اثر کے مالک تھے در اصل موجودہ زمانہ کی تمام سلطنتوں میں جو ترقی یافتہ صنعت وحرفت اور عالمی تجارت کی بنیادوں پر قائم ہیں، اصلی سیاسی طاقت بڑے بڑے مالدار اور متمول

اشخاص کے ایک چھوٹے سے طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو ملک کی صنعت وتجارت پر
چھائے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے لوگ عوام اور غریب طبقات کی جان و مال پر لامحدود
اختیارات رکھتے ہیں اور انہیں یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ جن لوگوں سے خوش
ہوں انھیں ترقیاں دے کر اپنے ساتھ ملالیں اور جن سے ناراض ہوں ان پر زندگی اور
معیشت کے تمام وسائل تنگ کر دیں۔ یہی حالت فرانس کی بھی تھی۔

۱۹۱۸ء کے بعد کا زمانہ

۱۹۱۸ء میں جرمنی کو متحدین کے ہاتھوں بڑی زبردست شکست ہوئی۔ فرانس اپنے
حریف کی اس شکست سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ۱۹۱۸ء کی فتح سے فرانس کے
حدود سلطنت میں بے اندازہ توسیع ہو گئی۔ آلسیس لارین (ALSAC & LORRAINE)
کا پورا علاقہ پچاس سال کے بعد جرمنوں کے ہاتھ سے نکل کر فرانس کے قبضہ میں آ گیا۔ مغربی
افریقہ کی جرمن نوآبادیات کو انگریزوں اور فرانسیسیوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ سلطنت عثمانیہ
میں سے شام کا وسیع اور زرخیز صوبہ بھی فرانس کے ہاتھ آیا۔ جرمنی کو اس کے برعکس آلسیس
لارین کے علاوہ پولینڈ کا ایک بہت بڑا صنعتی اور معدنی علاقہ چھوڑنا پڑا۔ جرمنوں کا جو حصہ
ملک ان کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ اس کے بیچوں بیچ پولینڈ کو ایک چھوٹا سا قطعہ دے دیا گیا۔ تا
کہ وہ سمندر تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ سے جرمنوں کا ملک دو علیحدہ حصوں
میں بٹ گیا۔ جن کے درمیان ایک دوسری سلطنت (یعنی پولینڈ) کا علاقہ حائل تھا۔
مالمیڈی (MALMED) کا ضلع بلجیم کے ہاتھ آیا۔ سار کے ضلع سے بھی جرمن
چند سال کے لئے محروم کر دیئے گئے۔ اسی طرح روس کی سابقہ سلطنت کے بھی ٹکڑے
ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعض حصے رومانیہ اور پولینڈ کے حوالہ کر دیئے گئے۔ . . . . .

. . . .

. . . . بالٹک کے علاقہ میں روسی سلطنت کے ایک وسیع حصہ
کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لتھوانیا۔ استھونیا۔ لیٹویا اور فنلینڈ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کی

گئیں۔ یہ صورت حال فرانس کے لیے بہت مفید تھی کیونکہ اب یورپ میں چار پانچ بڑی بڑی سلطنتوں کے بجائے صرف دو بڑی سلطنتیں رہ گئی تھیں۔ ایک فرانس اور دوسرے انگلستان۔ انگلستان کو جنگِ عظیم سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا اور نہ اس کے اثر و رسوخ یا حدود سلطنت میں کوئی اہم اضافہ عمل میں آیا۔ براعظم یورپ پر فرانس ہی سب سے بڑا اور سب سے طاقتور ملک تھا۔ جسے یہ موقع حاصل تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی کمزور سلطنتوں کو اپنی پالیسی اور مرضی کے مطابق جس رخ پر چاہے چلائے لیکن فرانس کے لئے ایک بڑی وجہ تردد یہ تھی کہ اس کی آبادی صرف چار کروڑ تھی جس میں اضافہ کی طرف کوئی میلان نہ تھا۔ اس کے برخلاف جرمنوں کی آبادی ساڑھے چھ کروڑ تھی اور آئندہ اس میں اضافہ کا بھی امکان تھا۔ اس لئے فرانس کو سب سے پہلے اپنے تحفظ کے وسائل تلاش کرنے ضروری تھے۔ ان وسائل کے حاصل کر لینے کے بعد اس کے آگے دولتمندی اور خوشحالی کے لامحدود مواقع تھے۔

جنگِ عظیم کے فاتحین کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ جرمنی کو اپنا محکوم بنا کر اس سے ناروا فوائد حاصل کریں۔ بلکہ وہ اس کو چاروں طرف سے گھیرے رکھنا چاہتے تھے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ روس کی بالشویکی سلطنت کا کسی نہ کسی طرح گلا گھونٹ دیا جائے۔ ان دونوں مقاصد کے حصول میں فرانس کا حکمران طبقہ ایک ممتاز اور نمایاں حصہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔

یورپ کی سیاست کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی پہلی نمایاں مثال ہمیں اس فوجی حملہ میں ملتی ہے جو فرانس نے شکست خوردہ جرمنی کے صنعتی علاقہ روہر (Ruhr) پر ۱۹۲۳ء میں کیا تھا۔ چونکہ جرمنی کو تاوان جنگ ادا کرنے میں تاخیر ہوئی اس لئے پائین کیر (POIN'CARE) نے روہر کی صنعتی وادی پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کیا جرمنی کی حکومت ابھی اس قابل نہ تھی کہ وہ اس حملہ کی فوجی مدافعت کرتی لیکن اس نے فرانس کے اس اقدام کا ہر دوسرے طریقہ سے مقابلہ کیا جس میں ایک عمومی ہڑتال (GENERAL STRIKE) کا حربہ بھی شامل تھا۔ اس ہنگامہ کی بدولت جرمنی کے

سکہ مارک کی قیمت تیزی سے گرنے لگی اور جرمنی میں ایک معاشرتی انقلاب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ خود فرانس کے سکہ کی قیمت پر اس معاشی انتشار کا برا اثر پڑا۔ کمیونزم کا بھوت رہائن لینڈ بلکہ پورے یورپ کے لئے ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا۔ امریکہ اور انگلستان کے بینک کار (BANKERS) اور سرمایہ دار جو یورپ پر فرانس کے بڑھتے ہوئے غلبہ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور جرمنی میں انقلاب کے اندیشہ سے خوفزدہ تھے ایک اشتراکی جرمنی کے مقابلہ میں جو روس کا حلیف ہو اس امر کو ترجیح دیتے تھے کہ جرمنی پھر سے سرمایہ داروں کی سرکردگی میں ایک طاقتور ملک بن جائے۔ چنانچہ وہ فوراً جرمنی کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے اور جرمنی پر سے تاوان جنگ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے انہوں نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا جسے منصوبہ ڈاز (DAWES PLAN) کہا جاتا ہے۔ فرانس کے سرمایہ داروں نے بادل ناخواستہ اس منصوبہ کو قبول کیا اور انھوں نے ۱۹۲۴ء میں روہر کے علاقہ سے فرانسیسی افواج واپس بلالیں۔ اس شکست کے لئے فرانس کے سرمایہ داروں نے امریکہ اور برطانیہ کے بینک کاروں کو مورد الزام قرار دیا۔ ان کا یہ الزام صحیح تھا کیونکہ فرانس کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کو برطانوی حکومت پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ یورپ میں برطانیہ خود اپنی توازن قوت کی پالیسی کو بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس نے فرانس کا ابتدا میں اس لئے ساتھ دیا تھا کہ جرمنی کی طاقت کو شکست دے کر یورپ کو اس کے اقتدار سے محفوظ رکھا جائے۔ اور روس کے اشتراکی نظام کو درہم برہم کر دیا جائے لیکن برطانیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ فرانس کو یورپ کی قیادت حاصل ہو جائے۔ اس مرتبہ کا وہ خود متمنی تھا۔ اس لئے فرانس کے مقابلہ میں برطانیہ جرمنوں کی امداد پہ پہنچ گیا۔ تاکہ اس طرح سے وہ ان دونوں پر اپنا اثر قائم رکھے۔ اس کے برخلاف امریکہ فرانس کے خلاف کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے یورپ پر برطانیہ کا اثر و اقتدار غالب آجائے لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ فرانس اس کے یورپی مفادات میں جا و بے جا مداخلت کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس لئے جن صورتوں میں فرانس کے خلاف کارروائی کرنے سے

برطانوی اثر و رسوخ کے پھیلنے کا اندیشہ نہ ہوتا، وہاں امریکہ کو فرانس کی پالیسی کو ناکام کرنے کی کوشش میں کوئی تامل نہ تھا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ امریکہ اور برطانیہ دونوں ملکوں کے ساہوکار اور تاجر فرانس کے بین الاقوامی منصوبوں کی راہ میں حائل تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے سرمایہ داروں کو فرانس کی راہ روکنے میں کیوں کامیابی ہوئی اس کا اصلی سبب فرانس کے داخلی نظام معیشت کی کمزوریاں تھیں۔ فرانس کو اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لئے ایک فوجی فتح کے علاوہ جو بعض سازگار حالات اور سیاسی رفاقتوں کا نتیجہ تھی کچھ اور وسائل بھی درکار تھے جو اس کے پاس موجود نہ تھے۔ ۱۹۰۰ء میں ایک برطانوی مشاہد نے اعداد و شمار فراہم کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ بیسویں صدی میں صرف پانچ علاقے ایسے ہیں جو عالمگیر طاقت کے مرکز بن سکتے ہیں۔ اوّلاً براعظم امریکہ جس پر ریاستہائے متحدہ امریکہ (UNITED STATES) کا اثر غالب تھا۔ دوئم برطانیہ، سوئم وسطی یورپ، چہارم روس اور پنجم مشرق بعید۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا اس دعوے کی تصدیق ہوتی گئی۔ روس کے انقلاب کے بعد ان پانچ مرکزوں میں سے چار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھے لیکن فرانس ان میں سے کسی میں بھی نہ آتا تھا۔ اس کی فنی مہارت اور معاشی وسائل اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے جتنے شکست خوردہ جرمنی یا برطانیہ اور امریکہ کے۔ ان ممالک کے مقابلہ میں اس کے مادی ذرائع محدود تھے۔ فرانسیسی سلطنت تجارتی آمدنی اور معاشی وسائل کا ویسا مؤثر ذریعہ نہ تھی۔ جیسے سلطنت برطانیہ۔ اُنیسویں صدی کی آخری ربع صدی میں فرانس کی قوت پیداوار کے اضافہ کی شرح ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی سے کم تھی۔ انگلستان کی قوت پیداوار کا اضافہ بھی تقریباً اتنا ہی سست رفتار تھا لیکن فرق یہ تھا کہ انگریزوں نے گذشتہ صدی میں اپنے حریفوں پر اتنی زبردست سبقت حاصل کر لی تھی کہ ابھی عرصہ تک وہ اس کے فوائد سے متمتع ہو سکتے تھے۔

مزدوروں کی تعداد کے اعتبار سے بھی جرمنی اور فرانس میں بڑا فرق تھا۔ ۱۹۱۳ء میں جرمنوں کی آبادی ۶ کروڑ ستر لاکھ تھی اور فرانس کی صرف چار کروڑ۔ ۱۹۲۹ء تک جرمنوں

کی آبادی ۴ کروڑ چالیس لاکھ رہ گئی تھی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں فرانس کی آبادی صرف دس لاکھ بڑھی یعنی فرانسیسیوں کی تعداد چار کروڑ سے چار کروڑ دس لاکھ ہو گئی۔ ان تمام موانع اور دشواریوں کے باوجود فرانس نے براعظم یورپ پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کیوں کی۔ اس کا جواب ہمیں مالیات کی پیچیدگیوں میں ملتا ہے۔ فرانس ایک صنعتی ملک سے زیادہ ایک ساہوکار اور سود خوار ملک بن گیا تھا۔ فرانسیسی باشندوں کا تمام پس انداز کردہ سرمایہ بالخصوص کسانوں کا جمع جتھا فرانس کے بینکوں میں جمع تھا ان بینکوں نے بڑی بڑی رقوم اپنے حلیفوں مثلاً زار روس یا ماتحت یورپی حکومتوں کو بطور قرض دے رکھی تھیں۔ اگر ہم اس سرمایہ کا حساب لگائیں جو فرانس نے بیرونی ممالک میں لگایا تھا تو معلوم ہوگا کہ یہ بیرونی سرمایہ اس کی قومی آمدنی کا (۱۵ فیصد حصہ تھا۔ حالانکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے مالدار اور متمول ملک کا بیرونی سرمایہ اس کی قومی آمدنی کا صرف (۴) فیصد حصہ تھا۔ اس طرح فرانس میں دولت کا ارتکاز و اجتماع انتہائی ترقی پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس اب ایک سود خوار ملک بن گیا تھا۔ جس کی آبادی کا بہت بڑا حصہ بغیر محنت و مشقت سود کی آمدنی پر زندگی گزارتا تھا۔ اس صورت حال کا اثر داخلی نظام معیشت (INTERNAL ECONOMY) پر بھی پڑا۔ بینک آف فرانس (BANK OF FRANCE) اور دو سو خاندان جو اس بینک کے معاملات پر حاوی تھے۔ فرانسیسی سیاست میں غیر معمولی مداخلت کرنے لگے۔ یہی دو سو خاندان فرانس کے اصل حکمران تھے۔ اُن کا حکومت پر اتنا غیر معمولی اثر تھا کہ یہ جب حکومت کو چاہتے شکست دے دیتے۔ قومی اور بین الاقوامی قرضوں کا سارا کاروبار انہیں دو سو خاندانوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ لوگ جب چاہتے اسٹاک ایکسچینج (STOCK EXCHANGE) میں ابتری پھیلا دیتے .... سرکاری کفالتوں کے (GOVERNMENT SECURITIES) کے دام گرا دیتے۔ اور فرانک کی قیمت کو بھی گھٹا بڑھا سکتے تھے۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کو سب سے زیادہ فکر اپنے اقتدار اور خصوصی مراعات کی تھی۔

اگر ان کے خصوصی مراعات اور اقتدار کو ذرا بھی دھکا لگتا تو یہ قوم کے مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں کوئی تامل نہیں کرتے۔ بلکہ بعض وقت قومی مفادات کے بالکل برخلاف پہلے اپنی معاشی اجارہ داری اور خصوصی اعزازات کی حفاظت کرتے تھے۔ جنگ عظیم کے بعد فرانس میں ایسی جتنی حکومتیں بنیں جن کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا یا جو معاشی عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہتی تھیں انہیں یا تو بنک آف فرانس کے احکام کی تعمیل کرنی پڑی یا وہ مسندِ اقتدار سے بے دخل ہو گئیں۔

چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب ایڈورڈ ہیریٹ (EDWARD HERRIOT) کی اشتراکیت پسند حکومت برسرِ اقتدار آئی تو فرانس کے لوگوں نے اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کیں لیکن یہ حکومت صرف دس ماہ قائم رہی اور آخر میں بینک آف فرانس اور اس پر حکومت کرنے والے دو سو خاندانوں نے ہیریٹ وزارت کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

فاسطیت کا عروج

اگر فرانس کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فرانس کا جمہوری نظام حکومت صرف ایک ظاہری پردہ تھا اور اصل طاقت چند مالدار خاندانوں کے ہاتھ میں تھی۔ فرانس میں سب سے کثیر التعداد طبقہ چھوٹے بورژوا (ادنیٰ متوسط طبقہ) کا تھا۔ کسانوں کی تعداد ایک تہائی تھی۔ انگلستان میں اس کے برعکس کسانوں، زمینداروں اور کاشتکار مزدوروں کی کل تعداد آبادی کا بیسواں حصہ بھی نہ تھی۔ چھوٹے بورژوا اور کسانوں کے علاوہ فرانس میں چھوٹے چھوٹے صنعتکاروں اور بیرونی ممالک سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی ایک قلیل تعداد تھی۔ ان سب کے اوپر ساہوکاروں، بینک کاروں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کا وہ طبقہ تھا جو اصل میں فرانسیسی حکومت اور سوسائٹی کا کارفرما عنصر تھا۔ ان لکھ پتی اور کروڑ پتی افراد کے ہاتھ میں فرانس کا نظام حکومت ایک کھلونا بن گیا تھا۔ مالدار طبقات اپنی غیر معمولی قوتِ زر (MONEY POWER)

کے باعث سیاستدانوں اور سرکاری عہدہ داروں کو رشوتیں کھلا کھلا کر پوری حکومت اور نظم و نسق کو جس رُخ پر چاہتے موڑ دیتے تھے۔ جب آبادی کی اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے برائے نام حقوق بھی مالدار طبقوں کی دستبرد اور غیر معمولی قوت زر کے باعث محفوظ نہیں ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ دستور کی رو سے اور قانون کی نگاہ میں ان کے شہری حقوق دوسرے افراد کے مساوی ہیں لیکن مالدار اور متمول اشخاص و طبقات اپنی معاشی طاقت کے زور سے عملاً جو چاہتے کرتے ہیں اور حالات و واقعات کے رُخ کو جدھر چاہتے موڑ دیتے ہیں۔ اور ان کی آزادی اور مساوات کا صرف نام ہی باقی رہ جاتا ہے۔ تو مذہب، آزادی، اخوت اور مساوات کے نعرے انھیں بالکل کھوکھلے نظر آنے لگتے ہیں اور ایک داخلی ہیجان کے لئے حالات سازگار ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں متوسط طبقات کیلئے دو راستے کھلے رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مزدوروں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کی حفاظت کریں۔ اور مالدار سرمایہ داروں کی منظم معاشی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے مزدوروں سے اتحاد پیدا کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ سرمایہ داروں کی خوشامد درآمد کر کے ان کے ساتھ مزدوروں اور عوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں اور اس طریقہ سے مالدار طبقوں کو خوش کر کے اُن سے اپنے لئے کچھ مراعات حاصل کر لیں۔

فرانس میں پہلی صورت پیش آئی اور متوسط طبقات نے عوام کے ساتھ مل کر سرمایہ داروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا جس کو (POPULAR FRONT) کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں ریمزے میکڈانلڈ اور دوسرے مزدور رہنماؤں نے دوسری صورت اختیار کر کے سرمایہ داروں کا ساتھ دیا۔ جب فرانس میں متوسط الحال افراد اور مزدور طبقہ کا متحدہ محاذ قائم ہو گیا تو مالدار حکمران طبقات بہت گھبرائے اور انہوں نے اپنے داخلی نظام کی کمزوریوں کو چھپانے اور غیر مطمئن عوام کو دبانے کے لئے طرح طرح کی سیاسی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں۔ مثلاً انھوں نے فرانسیسی سوویٹ معاہدہ (FRANCO SOVIET PACT) کو جو ۱۹۳۴ء میں طے پایا تھا کالعدم کرنے کے لئے جرمنوں سے ساز باز کرنی شروع کی۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ فرانسیسی سوویٹ

معاہدہ سے متوسط اور مزدور طبقوں کے متحدہ محاذ کو قوت پہنچے گی۔ اس کے برخلاف جرمنی کے سرمایہ داروں کا ساتھ دینے میں فرانس اور جرمنی دونوں ملکوں کے سرمایہ داروں کا مفاد مشترک تھا۔ اس لئے ہٹلر کے برسراقتدار آنے سے پہلے فرانس کے مالدار حکمران طبقے نے جرمنی کے مزدوروں اور عوام کی طاقت کو کمزور کرنے اور اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے خطرہ کا سدباب کرنے کے لئے جرمنی کے سرمایہ داروں کی مدد کرنی شروع کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ممالک کے سرمایہ دار مل کر اپنی مشترکہ طاقت سے جرمنی اور فرانس کے غیر مطمئن عوام کی طاقت کو کچل دیں سوویٹ فرانسیسی معاہدہ کو توڑنے کا کام لاوال نے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ لاوال کو اس معاہدہ پر مجبوراً دستخط کرنے پڑے تھے۔ لیکن ابھی فرانسیسی پارلیمنٹ کو اس کی توثیق کرنی تھی۔ اس لئے لاوال نے کئی ماہ تک اس کی توثیق کو ملتوی رکھا۔ پھر جب ہٹلر کے برسراقتدار آنے سے جرمنی کی طاقت بہت زیادہ بڑھنے لگی تو لاوال نے سر جان سائمن، رامزے میکڈانلڈ اور مسولینی کے ساتھ مل کر ۱۹۳۵ء میں بمقام اسٹریسا (STRESA) ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ ان تینوں نے ہٹلر کے خلاف جس کی قوت اب خوفناک انداز سے ترقی کر رہی تھی، اس مشاورت کے بعد ایک مشترکہ محاذ قائم کیا جس کو اسٹریسا محاذ کہا جا سکتا ہے۔ اسٹریسا کی مجلس مشاورت میں حبشہ کے مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں آیا حالانکہ مسولینی اس زمانہ میں حبشہ کے خلاف جنگ کی علانیہ تیاریاں کر رہا تھا۔ رامزے میکڈانلڈ نے بھی اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔ لیکن لاوال اور مسولینی کے درمیان حبشہ کی بابت ایک خفیہ معاہدہ طے پا چکا تھا۔ انگلستان کی رائے عامہ نے حبشہ کی حمایت کے لئے وہاں کی حکومت پر اتنا زبردست اثر ڈالا کہ بالآخر حکومت انگلستان کو مجلس اقوام میں مسولینی کے خلاف اہل حبشہ کی حمایت میں آواز بلند کرنی پڑی اس موقعہ پر لاوال نے خفیہ طور پر مجلس اقوام میں حبشہ کے مقدمہ کو کمزور کرنے کی پوری پوری جدوجہد کی اور اسی کی کامیاب کوشش کا نتیجہ تھا کہ مجلس اقوام مسولینی کے خلاف حبشہ کے معاملہ میں کوئی عملی اقدام نہ کر سکی۔ پھر بھی لاوال تھا جس نے سر سیموئیل ہور کے ساتھ

مل کر بالڈون چیمبر لین اور حکومت انگلستان کے دیگر ارکین کی علم و اطلاع میں حبشہ کی تقسیم کے لئے ایک تجویز مرتب کی جو تاریخ میں ہور لاوال تجویز HORRE LAVAL PLAN) کے نام سے مشہور ہے۔

فرانس کی خارجی حکمت عملی میں جو اس نے جرمنی کے بالمقابل اختیار کی یہی خوف کام کر رہا تھا کہ مبادا ملک کے غیر مطمئن عوام کی طاقت میں اضافہ ہو جائے۔ اور روس کی اشتراکی حکومت کی تائید کے ساتھ وہ سرمایہ دار طبقوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ ہٹلر کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو روکنے کے بجائے اس کی جارحانہ کارروائیوں اور توسیعی اقدامات پر خاموشی اختیار کی گئی۔ چنانچہ ۷ر مارچ ۱۹۳۶ء کو ہٹلر نے معاہدہ ورسائی کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے رہائن لینڈ کے غیر فوجی علاقہ میں اپنی افواج داخل کر دیں۔ اگر اس وقت فرانسیسی حکومت اپنی فوجوں کا اجتماع عام (GENERAL MOBILSATION) عمل میں لے آتی تو برطانوی حکومت کو چار و ناچار اس کی پشت پناہی کرنی پڑتی لیکن فوجوں کا اجتماع کرنے کے بجائے فرانسیسی وزراء نے برطانوی حکومت سے مشورہ کرنا ضروری خیال کیا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ نے فرانس کو اجتماع افواج کے خلاف رائے دی۔ اس کے بجائے اس نے ہٹلر کو دھمکانے کے لئے اس سے چند سوالات کئے جو معاہدہ ورسائی کی خلاف ورزی سے متعلق تھے۔ ہٹلر نے حکومت برطانیہ کے مراسلہ کو ردی کی ٹوکری کے حوالہ کر دیا۔

اقتصادی کساد بازاری

۱۹۳۲ء میں دنیا کے دیگر ممالک کی طرح فرانس بھی عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کے دام میں پھنس گیا۔ ملوکیت کے حامیوں اور فاسسطوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند عناصر کو سیاست کے میدان میں شکست دینی شروع کی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپ کے دوسرے

ممالک میں فاسطیت زور و شور سے ترقی کر رہی تھی۔ فرانس کے ملوکیت پسند اور فاسطی عناصر کو قدرتاً اس صورت حال سے اور زیادہ تقویت پہنچی، دوسری بات یہ تھی کہ جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند گروہوں کی حکومتوں نے گذشتہ چند سالوں میں ملک کے پیچیدہ مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کیا اور نہ عوام کو اُن بے جا قیود اور بندشوں سے آزاد کرانے میں کوئی کامیابی حاصل کی جو مالدار اور متمول طبقات نے ان پر عائد کر رکھے تھے ایک مزید وجہ یہ ہوئی کہ جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند گروہوں کی حکومت کے زمانہ میں فرانس کے مالی حلقوں میں فریب کاری، جعلسازی اور بے ایمانی کے کئی ایسے واقعات پیش آئے۔ جن سے ان کی حکومت کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اُن میں سے ایک واقعہ جس میں اسٹاوسکی (STAVISKY) نامی ایک شخص شریک تھا اتنا زبردست تھا کہ اس پر سارے ملک میں ایک عام ہیجان برپا ہوگیا اور فرانس کے ملوکیت پسندوں اور فاسطیوں نے اس واقعہ کی بنا پر جمہوریت اور اشتراکیت پسندوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ بھی ان دھوکہ بازوں اور ٹھگوں کی کارروائیوں میں شریک تھے۔ انگلستان کے کئی اخبارات نے جو متمول طبقات کے نمائندے تھے۔ فرانس کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس ملک کی تجارتی اور اقتصادی بے ایمانیوں کا رونا رویا اور بتایا کہ فرانس کی تجارتی اور اقتصادی زندگی میں ایمانداری، سچائی اور اصول پسندی کا بالکل خاتمہ ہوگیا ہے۔

اسٹاوسکی (STAVISKY) کون تھا اور اس نے فرانس میں کیا کیا گل کھلائے اس کا حال ہمیں ایک تقریر سے معلوم ہوگا جو ایک فرانسیسی سوشلسٹ لینگرینج (LANGRANGE) نے ۱۹۳۴ء میں کی تھی۔ اس تقریر کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"اسٹاوسکی کو ناچ گھروں اور گھوڑ دوڑ کے مشاغل سے خاص شغف تھا۔ اس زمانہ میں وہ ایک نہایت عالیشان موسیقی گھر چلا رہا تھا۔ لیکن اسے گروی (رہن) کے کاروبار سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ آرلینس ORLEANS کے شہر گیا اور وہاں اس نے چند زمرد رہن رکھا ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ زمرد اصلی تھے یا نقلی۔ بہر حال اسے کچھ کہا روپیہ وصول ہوا۔ چند ہی روز بعد اس کی کئی ایک شکایات پیش ہوئیں اور سارے شہر میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا۔ حکومت نے فوراً تحقیقات کا حکم دیا۔ اس تحقیقات کا نتیجہ کیا ہوا کوئی نہیں جانتا ہے لیکن اسٹاویسکی نے شکایت کنندوں کو روپیہ واپس کرکے بیون (BAYONNE) کی راہ لی اور وہاں رہن اور گروی کا کاروبار شروع کرکے ایک دوکان چلانی شروع کی۔ اس کاروبار سے اُسے اتنا مالی فائدہ حاصل ہوا کہ وہ ایک کمپنی کا ناظم ہوگیا۔ اس کے علاوہ وہ کئی روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کا مالک بن بیٹھا اور اس نے کئی ایک تھیٹر بھی کھول لیے۔ غرضیکہ اب وہ سچ مچ پیرس کا بادشاہ تھا۔ اس کے تعلقات بہت وسیع تھے اور متعدد اشخاص جو بڑے باثر اور صاحب رسوخ تھے اس کے گہرے دوستوں میں سے شمار کیے جاتے تھے۔ یہ لوگ اسٹاویسکی کے ذریعہ مختلف کمپنیوں کی مجلس نظمار کے رکن بننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اگر وہ اپنے جعلی ہنگری (HUNGARIAN) تمسکات (BONDS) جن کی قیمت ۵ ارب فرانک تھی بازار میں فروخت کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو یہ تھوکا فضیحتی نہ ہوتی بلکہ ملک میں ایک معاشی اور اقتصادی ہیجان برپا ہوجاتا۔ لیکن اس کی تمام تدابیر ناکام ہوگئیں۔ اور اس کے بہت سے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ پولیس کے بیان کے مطابق خود اسٹاویسکی نے خودکشی کرکے جان دی۔

"اب میں سوال کرتا ہوں کہ ایک ایسا بدنام شخص جس کو سنہ ۱۹۲۷ء میں مشروط

طرح رہا کیا گیا تھا اور ایک جواری جسے پولیس نے مجرموں کی فہرست میں داخل کیا تھا اور جس کو تمام ناچ گھروں میں داخل ہونے سے حکماً منع کر دیا گیا تھا کس طرح اتنے دنوں تک آزادی کے ساتھ دغا اور فریب کے ذریعہ پبلک کو لوٹ کھسوٹ کر لاکھوں کروڑوں روپیہ پیدا کرتا رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے محکمہ پولیس ہماری عدالتوں ——— ہمارے سرکاری اور کاروباری دفاتر - ہمارے اخبارات اور ہماری پارلمنٹ میں اس کو حریص اور طامع افراد کی ایک کثیر تعداد مل گئی - جنہوں نے اس کی حرکات سے چشم پوشی کی۔

پھر سوال یہ ہے کہ پولیس نے اس کے خلاف بروقت کارروائی کیوں نہیں کی جبکہ وہ اس کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھی۔ سرکاری ممانعت کے باوجود اُسے ناچ گھروں میں داخلہ کی اجازت کس نے دی۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۷ء میں عارضی طور پر رہائی ملنے کے بعد اسٹاوسکی بیوان گیا۔ یہاں اسے ہر طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا گیا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ لیکن اتنے طویل عرصہ میں بھی اس کی کوئی گرفت نہیں کی گئی۔ پھر اس نے میونسپلٹی کے قرضوں کا دھندہ شروع کیا لیکن اس جعلسازی پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ حالانکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ خفیہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ بیارٹز (BIARRITZ) میں اس نے کروڑ ہا روپیہ کا جوا کھیلا۔ یہاں وہ بڑے کرّوفر سے رہتا تھا حالانکہ نہ کسی شخص کو اس کا پتہ معلوم تھا اور نہ اس کا ذریعہ آمدنی۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے ایک سابقہ پولیس افسر۔ ایک فوجی جنرل اور ایک پنشن یافتہ سرکاری عہدیدار کے ساجھے میں ایک کمپنی قائم کی۔ ۱۹۳۳ء میں اس نے ایک اور کمپنی قائم کی جس کے نظماء میں سے فرانس کا ایک سابقہ وزیر خارجہ بھی تھا محکمہ پولیس اور محکمہ فنانس اس وقت کیا کر رہے تھے اب ہمیں اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کے ایک بڑے عہدہ دار نے اس کے متعلق تفصیلی رپورٹیں تیار کی تھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ حکومت نے ان رپورٹوں پر کارروائی کیوں نہیں کی۔ پھر جب آخری وقت میں اسٹاوسکی کی گرفتاری ناگزیر ہوگئی تو وہ پولیس کی گرفت سے

نکلنے میں کیونکر کامیاب ہوگیا۔ اس غفلت کا ذمہ دار کون ہے؟"

فرانس کا ذہنی اور اخلاقی انحطاط

فرانس کے ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا اسکی فوجی شکست میں کتنا دخل تھا۔ اس کا حال ہمیں پروفیسر نمیر کی کتاب (EUROPE IN DECAY) سے معلوم ہوتا ہے ذیل میں ہم پروفیسر نمیر (PROF NAMIER) کی کتاب کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں :-

" ہٹلر نے معاہدہ ورسائی کے بالکل برخلاف جب رہائن لینڈ پر قبضہ کرلیا تو فرانس کے ارباب حل وعقد نے جرمنی کے اس اقدام پر کوئی فوجی کارروائی نہیں کی حالانکہ یہ فرانس کے خلاف سب سے بڑا مہلک قدم تھا جو ہٹلر اٹھا سکتا تھا۔ فرانسیسی قوم کی اس بے عملی کے وجوہات بیان کرتے ہوئے ایم فلانڈن M. FLANDIN جو ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان وزیر اعظم رہ چکا تھا لکھتا ہے :-

فوج کی مجلس اعلیٰ کا ایک اجلاس چند ہی روز بعد منعقد ہوا۔ وزرائے فوج اور ان کے مشیر خاموش بیٹھے اور جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ فوری طور پر کیا فوجی کارروائی کی جاسکتی ہے تو وزیر جنگ نے بیان کیا کہ فرانسیسی فوج کو دفاعی اصولوں پر تربیت دی گئی ہے اور جس پیمانہ پر میں نے فوجی مداخلت تجویز کی تھی۔ اس کی پہلے سے کوئی تیاری نہیں کی گئی ہے

فرانس کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جبکہ ایک وزیر خارجہ نے جنگی کارروائی کا مشورہ دیا۔ اور وزرائے فوج جنگ کے لئے تیار نہ تھے۔

رہائن لینڈ پر ہٹلر کی فوج کشی کے بعد پیرس میں فرانسیسی کابینہ کا جو اجلاس

ہوئی، اس کا حال ہیلانڈن نے حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہے :-

کابینہ پر ایک ذہنی انتشار طاری تھا۔ میں نے حالات بیان کئے اور یہ بھی کہا کہ میں مجلس اقوام کے سکوٹری کو اس واقعہ کی اطلاع دے چکا ہوں، لوکارنو کے معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی کہ مجلس اقوام کی کونسل کو اس امر کے فیصلہ کا اختیار ہوگا کہ کونسا عمل معاہدہ شکنی کی تعریف میں آتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ لندن میں اس شرط پر عملدرآمد کو ضروری تصوّر کیا جاتا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کس قسم کی فوجی کارروائی کرنی مناسب ہوگی اور یہ کارروائی کب عمل میں آئے گی۔ اگرچہ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ برطانوی حکومت کو اصرار ہے کہ معاہدہ لوکارنو کی ضامن حکومتوں کے تصفیہ سے پہلے کوئی کارروائی عمل میں نہیں آنی چاہیئے۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب وزیر جنگ نے بتایا کہ صرف میجنولا ئن پر مدافعین کو تعینات کر دینا اور وادی رہون (RHONE) سے مشرقی سرحد کی جانب دو ڈویژن فوج منتقل کر دینا کافی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جنرل اسٹاف کا مطالبہ ہے کہ رہائن لینڈ پر فوجی کارروائی کی صورت میں پہلے افواج کا اجتماع عام (GENERAL MOBILISATION) عمل میں لایا جائے۔ اس بیان سے کابینہ میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ وزیروں نے کہا کہ انتخابات سے چھ ہفتہ قبل افواج کا اجتماع عام ناممکن العمل ہے۔ آخر میں صرف چار وزیر جن میں ایک

ہیں خود تھا فوجی کارروائی کے حق میں تھے۔ باقی کابینہ کا
فیصلہ یہ تھا کہ ملک کے اندر اور باہر رائے عامہ کا ردعمل
معلوم کرنے کے بعد
کوئی قدم اٹھایا جائے۔

ایم سرات (SARRAUT) نے ایک نشری تقریر کے ذریعہ فرانس کی رائے عامہ بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ہم اسٹراسبرگ[1] کو جرمن توپوں کی زد میں دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس تقریر کا رائے عامہ پر کوئی اثر نہ ہوا ایم۔ فلانڈن اس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

" یقیناً فرانس کا قومی احساس مردہ ہو چکا ہے"

۱۶ مارچ کو معاہدہ لوکارنو کے ضامنوں کی ایک کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی۔ چونکہ برطانوی وفد کو اپنی حکومت کی طرف سے محدود اختیارات ملے تھے۔ اس لیئے ایم فلانڈن نے حکومت فرانس پر زور دیا کہ وہ اس مسئلہ کا خود کوئی تصفیہ کرے اس نے فرانسیسی حکومت کو متنبہ کیا کہ گفت وشنید کے اس دلدل میں اپنے آپ کو پھنسائے رکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ " معاہدہ لوکارنو کے تحت فرانس کو اختیار ہے کہ اس معاہدہ کی فوجی دفعات کی خلاف ورزی کا ثبوت مہیا ہونے پر بلکہ اس سے پہلے ہی وہ جو قدم چاہے اٹھا سکتا ہے۔ بہر حال اس میں تو کوئی امر مانع نہیں ہے کہ احتیاط کے طور پر افواج کا اجتماع عمل میں لایا جائے اگرچہ یہ اقدام بھی اب بیکار معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انگلستان اور بلجیم ہماری کارروائی سے اتفاق نہیں کرینگے۔ کابینہ کو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ آیا فرانس کے موجودہ اور آئندہ مفاد کی خاطر انگلستان سے طویل طویل گفت وشنید کرنے کا خطرہ مول لینا مناسب ہوگا یا انگریزوں کی مخالفت کی پرواہ کے بغیر کارروائی کا آغاز

---

[1] اسٹراسبرگ فرانسیسی جرمن سرحد پر فرانس کا ایک شہر ہے۔

کر دینا زیادہ بہتر ہوگا۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں تو یہی کہوں گا کہ جرمن افواج کے خلاف مزاحمتی کارروائی شروع کر دینی بہتر ہے"۔ ایک مرتبہ پھر وزرائے فوج نے اپنی مشکلات کا رونا رویا اور مذبذب اراکین کابینہ نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب برطانیہ جرمنوں سے رہائن لینڈ کے تخلیہ کی بابت گفت و شنید کرنے پر تیار ہے تو خواہ مخواہ فوجی کارروائی کر کے جنگ کا خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس پر پال بینکور (PAUL BANCOUR) اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

ہمیں انگلستان بلجیئم یا مجلس اقوام سے استمزاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ پہلے فوجی کارروائی کا آغاز کر دینا چاہیئے تھا۔ ایسا قدم اٹھا لینے اور معاہدہ کی خلاف ورزی کا موثر جواب دینے کے بعد ہمیں مجلس اقوام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تھا بشرطیکہ کوئی اور حکومت اس کے سامنے یہ معاملہ اٹھاتی۔"

فرانس کے اسباب شکست کی توجیہہ کرتے ہوئے وزیراعظم ایم۔ رینو (M. REYNAUD) لکھتا ہے:۔

۱۹۱۸ء کے بعد فرانس میں فتح کے نہیں موت کے آثار نمایاں تھے۔ گذشتہ صدی کے آخری حصہ سے قوم میں ایک اخلاقی زوال کی ابتداء ہو چکی تھی۔ فرانس امن اور صلح کا خواہشمند تھا۔ لیکن اس نے وہ ذرائع اور وسائل مہیا نہیں کیے جن سے امن کی ضمانت ہو سکتی۔ معاہدہ لوکارنو بزدل لیڈروں کا سودا تھا۔ اس میں میونخ (MUNICH) کا رنگ نظر آتا ہے اس کے بعد ہٹلر کا عروج اور فرانس کا تدریجی زوال شروع

ہوا۔ قوم میں ایک طرح کی سستی اور کاہلی پیدا ہو گئی اور
یہ تخیل دماغوں میں بس گیا کہ میجنو لائن کی آڑ میں بیٹھ کر
فرانس کامیاب طور سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے اس
سے بھی بڑھ کر ایک شدید قسم کی امن پسندی کا دَور
دورہ شروع ہوا جس کے مبلغین یہاں تک
کہنے لگے کہ غلامی جنگ سے بہتر ہے۔ لوگوں کی حب
الوطنی اس شرط کے ساتھ مشروط ہو گئی کہ ان کی پارٹی
برسرِ اقتدار ہو، باہمی رشک وحسد اتنا بڑھا کہ
بعض لوگ یہ کہتے نظر آنے لگے کہ بلم (Blum)
کے مقابلہ میں ہم ہٹلر کی حکومت کو ترجیح دیں گے
اس اخلاقی زوال اور فوجی کمزوری میں گہرا تعلق تھا"
آگے چل کر ایم رینو لکھتا ہے :۔
کسی فوج سے یہ کہنا کہ تم صرف محفوظ قلعہ بندیوں کی
آڑ میں لڑ سکتے ہو، اس کی جرأت و ہمت کو فنا کر دینے
کے مترادف ہے، فرانس کو صرف دفاعی فوج سے
آراستہ کرنا زمانہ ما لعبد جنگ میں ہمارے اخلاقی
اور ذہنی انحطاط کا سب سے بڑا ثبوت ہے"
جون ۱۹۳۶ء میں فرانس کی وزارتِ عظمٰی کا جائزہ لینے کے بعد بلم نے فوج
کے ارباب حل و عقد سے فرانسیسی افواج کی حالت کے بارے میں سوال کیا
پیتاں نے جواب دیا کہ فرانسیسی فوج پوری طرح تیار ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی
فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے، ۹ جولائی کو جنرل دیگان نے بتایا :۔
" آپ پوچھتے ہیں کہ فرانسیسی فوج کی کیا حالت ہے
میں آپ سے صاف صاف کہوں گا اور صرف سچائی کو مدِ نظر

رکھوں گا۔ میرا یقین ہے کہ فرانسیسی فوج اپنی پوری تاریخ
میں اس سے زیادہ بہتر حالت میں کبھی نہ تھی۔ اس کے
اسلحہ اعلیٰ ترین قسم کے ہیں۔ اس کی قلعہ بندیاں نہایت
مضبوط، اس کی جرأت وہمت بے مثال اور اس کی
قیادت دانشمندانہ ہے۔ ہم میں سے کسی کو جنگ کی آرزو
نہیں ہے لیکن اگر جنگ چھڑ جائے تو میں وثوق کے ساتھ
کہہ سکتا ہوں کہ فتح ہماری ہوگی۔"

ہٹلر کی جرأت مندانہ اور پُر عزم سیاست کے مقابلہ میں فرانس کا کیا
طرزِ عمل تھا اس کا حال لکھتے ہوئے (EUROPE IN DECAY)
کا مصنف کہتا ہے :-

"۲۱ اگست کو جبکہ روس اور جرمنی کے باہمی معاہدہ
کی تکمیل قریب الوقوع تھی۔ ایم بانٹ وزیر خارجہ
نے قومی مجلس دفاع سے حسب ذیل سوال کیا :-

کیا یہ ضروری ہے کہ ہم نے پولینڈ سے جو معاہدہ
کیا ہے اس پر دیکھے سنے بغیر پوری طرح عملدرآمد کرنے
پر تیار ہو جائیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم پولش حکومت پر
دباؤ ڈال کر اسے ہٹلر کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور کریں
اس سے ہمیں کچھ مزید مہلت مل جائے گی۔ جس میں ہم
اپنے اسلحہ اور ساز و سامان کی تعداد بڑھا سکیں گے
اپنی فوجی قوت کو مضبوط اور سیاسی حالت کو درست
کر سکیں گے تاکہ کچھ مدت کے بعد ہم جرمنی کا زیادہ موثر
طور سے مقابلہ کر سکیں۔ لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ہے
کہ اس وقت مصالحت کر لینے سے فرانس اور پولینڈ کا

معاہدہ کمزور پڑ جائے گا۔ جس کو فرانس کی حفاظت اور
مدافعت کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ کیا فرانسیسی
جنرل اسٹاف اس معاہدہ کو اب بھی ویسا ہی ضروری
خیال کرتا ہے۔"

بانٹ کی مصالحت پسندانہ روش کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ جنرل گیملین نے بتایا کہ اگر پولینڈ کو اس طرح ہٹلر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو وہ اس ملک کو چند روز کے اندر ختم کر کے اپنی پوری فوج فرانس کی سرحدوں پر جمع کر دے گا اور اس وقت فرانس اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہوگا۔ جب ۳۱ اگست کو مسولینی نے پولینڈ اور جرمنی کے درمیان بیچ بچاؤ کرنے کا پیشکش کیا تو بانٹ نے بڑی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا لیکن برطانیہ اور پولینڈ کو اصرار تھا کہ مصالحت کی گفت و شنید سے قبل جرمنی کو اپنی افواج پولینڈ سے واپس بلانی چاہییں اس لئے بانٹ کو اطالوی بیچ بچاؤ سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا۔

۲ ستمبر ۱۹۳۹ء تک یہ بات ظاہر ہو گئی کہ برطانوی حکومت جرمنی کے خلاف فوری کارروائی کا مطالبہ کر رہی تھی اور فرانس کی حکومت لیت و لعل کر رہی تھی۔ ایم بانٹ نے پہلے دستوری مشکلات کا عذر کیا۔ اس نے بتایا کہ جرمنی کو الٹی میٹم دینے کے لئے فرانسیسی پارلیمنٹ کا ووٹ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ عذر پیش کیا کہ میں اطالوی وزیر خارجہ کاونٹ کیانو سے ۲ ستمبر تک انتظار کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اس درمیان میں اس نے سرحدی علاقوں سے عورتوں اور بچوں کے تخلیہ کا ذکر کرنا شروع کیا۔ فرانسیسی فوج بھی مصر تھی کہ اسے کچھ مزید وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے انتظامات مکمل طور سے ٹھیک کر لے۔ برطانوی حکومت نے اسی روز جبکہ جرمن فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کیا۔ یہ تجویز کی کہ برطانوی اور فرانسیسی سفراء جرمنی سے واپس بلا لئے جائیں۔ اس نے ۲ ستمبر کو پونے پانچ بجے شام کے وقت بانٹ کو اطلاع دی کہ وہ ہٹلر کو آدھی رات تک پولینڈ سے فوجیں واپس بلا لینے کا موقعہ دیگی

اور اگر اس کے بعد بھی ہٹلر نے اپنی فوجوں کا تخلیہ نہ کیا تو وہ جنگی کارروائی کا آغاز کر دے گی۔ اس کے باوجود فرانسیسی کابینہ کا فیصلہ یہی تھا کہ دوسرے روز تک جرمنی کو الٹی میٹم نہ دیا جائے۔ چنانچہ چیمبرلین کو پونے دس بجے رات فرانس کے اس فیصلہ کی اطلاع دی گئی۔

ایم بادوین (M. BAUDOIN) فرانس کی فوجی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:—

"میں نے جنرل ویگان سے کہا کہ فرانس میں صرف مادی اور فوجی وسائل کی کمی نہیں بلکہ روحانی قوت کا بھی فقدان ہے۔ اس ملک میں اخلاقی طاقتوں کو شکست ہو چکی ہے —— فرانسیسی نوجوانوں کو کسی ایسے عقیدہ کی تعلیم نہیں دی گئی جس کے لئے ان کے دلوں میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ اگر ملک کو بچانا ہے تو تعمیر نو کا کام جلد شروع ہونا چاہئے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ہر طرف شک و تذبذب اور عقائد کی کمزوری کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ فرانس کے نظم و نسق پر ایک نااہل حکمران طبقہ حاوی ہو گیا ہے۔ جس کو اپنے مفاد کے آگے قوم یا ملک سے کوئی محبت نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اہل ملک اور اہل فوج میں اتنی جرأت و ہمت باقی ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی جرمنوں کی اطاعت کا خیال نہ کریں۔"

مئی ۱۹۴۰ء میں جبکہ فرانس کی فوجی شکست قریب تھی تو پندرہ فوجی جنرلوں کو ان کی خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جنرل ویگان کو اس کارروائی سے پورا پورا اتفاق نہیں تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ فرانس کی شکست کے بانی مبانی فوجی

لیڈر نہیں ہیں۔ اس نے ایک بیان میں بتایا کہ "جو کچھ ہمیں اس وقت بھگتنا پڑ رہا ہے وہ گزشتہ بیس سال کی غلطیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہے یہ بڑی بے انصافی ہو گی اگر ہم صرف فوجی جنرلوں کو خطاوار قرار دے کر انہیں سزا" ان کی خدمات سے برطرف کر دیں اور ان استادوں اور معلموں کو بری الذمہ کر دیں جنہوں نے قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو حب الوطنی اور ایثار و جفاکشی کی تعلیم نہیں دی۔"

فریڈرک شومین (SCHUMAN) نے اپنی کتاب INTER - (NATIONAL POLITIES -) کے چوتھے حصہ میں فرانس کی شکست کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"بڑی بڑی قوموں کو بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں شکست کا مزہ اسی صورت میں چکھنا پڑتا ہے جبکہ پہلے وہ خود اپنے باہمی اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اندرونی طور پر شکست کھا چکی ہوں۔ نپولین کی عظیم الشان فتوحات میں اس کی بے نظیر فوجی مہارت کے علاوہ ایک بڑا عنصر یہ بھی تھا کہ براعظم یورپ کی سلطنتیں اندرونی انتشار میں مبتلا تھیں جو کہ طبقاتی اختلافات سے پیدا ہوا تھا۔ ہٹلر کی جارحانہ کارروائیاں بھی اسی باعث کامیاب ہوئیں کہ اس کی مفتوحہ اقوام شدید اندرونی اختلافات کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھیں۔ جمہوریت کے زوال کے ابتدائی دور میں ہر ملک کے سرمایہ دار اور متمول افسر دفاشسطی تحریک کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ ان کے دل میں یہ غلط خیال جم گیا تھا کہ یہ تحریک ادنٰے طبقوں کی کامیاب بغاوت اور انقلاب سے ان کی حفاظت کرے گی۔ اس کے برخلاف بہت سے

مزدوروں بعض کسانوں اور چھوٹے چھوٹے دوکانداروں کو یہ شبہ تھا کہ متمول طبقات کی نمائندگی کرنیوالے سیاستدانوں اور حکمرانوں کو روم اور برلن کی استبدادیت سے گہری ہمدردی ہے۔ یہ لوگ قومی مفاد کو طبقاتی اغراض پر قربان کرنے کیلئے تیار ہیں۔ حالانکہ اگر یہ اپنے طبقاتی اغراض کو بھی ذرا وسعت نظر سے دیکھتے تو انہیں اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا۔ یہ شبہات حق بجانب تھے۔ سرمایہ دار ممالک میں خوشحال طبقوں کے افراد آرام کی زندگی گزارتے تھے لیکن انہیں یہ خطرہ تھا کہ معاشی کساد بازاری۔ انقلابی تحریکات اور جنگ و جدال کی وجہ سے ان کی خصوصی مراعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جن پر ان کا تفوق مبنی تھا۔ اس لئے یہ لوگ خفیہ طور پر آمروں کی استبدادی حکومتوں سے ہمدردی رکھتے تھے کیونکہ ان حکومتوں نے مزدور طبقہ کو بالکل دبا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوری ممالک میں امن پسندی اور ڈکٹیٹروں کے ساتھ مصالحانہ رویہ کا رجحان پیدا ہو گیا اور جمہوری حکومتیں فاسسطی لیڈروں کے جارحانہ عزائم سے قصداً چشم پوشی کرنے لگیں۔ یہ حماقت یہاں تک بڑھی کہ فاسسطی ملکوں کی طاقت ان کے لئے خطرہ کا باعث بن گئی اور انہوں نے اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کر لیا۔ جب حکمران طبقہ زوال پذیر ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات دشمنوں کو اپنا محافظ خیال کرنے لگتا ہے۔ جرمنی، اطالیہ اور جاپان کے مالدار اور سرمایہ دار طبقوں نے اپنی قسمتیں ایک فوجی جماعت کے

ہاتھ میں اس مغالطہ کے تحت دے دیں کہ وہ اُسے اپنے
قابو میں رکھ کر اس سے اپنے مفاد کی خدمت کا کام لیں گے
اس طرح انھوں نے اپنا سیاسی اقتدار خود ہی دوسروں کے
حوالہ کر دیا۔ اس صورتِ حال سے سبق لینے کے بجائے
فرانس، برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے متمول طبقات نے
بھی فاسسطی ڈکٹیٹروں کے مقابلہ میں کچھ اسی قسم کا
طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ انھیں بھی وہی نتیجہ بھگتنا پڑا۔"

جرمنی اور اطالیہ کے جارحانہ عزائم کے مقابلہ میں فرانس کے اربابِ اقتدار کا
رویہ کیا تھا۔ اس کا حال بیان کرتے ہوئے شومین لکھتا ہے :-

"لاوال فرانسیسی روسی معاہدہ کی توثیق کو برابر
ٹالتا رہا یہاں تک کہ اسٹریا پر جرمن قبضہ نے بالآخر
اسے اس کارروائی کی تکمیل پر مجبور کر دیا باوجود اس امر
کے کہ فرانس روس سے معاہدہ کر چکا تھا۔ لاوال کی صدارت
میں فرانسیسی حکومت نے جرمنی سے مقابلہ کرنے کے لئے
روس کے بجائے اطالیہ اور انگلستان کو راضی کرنا شروع
کیا۔ انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے جن کی پالیسی یہ تھی
کہ یورپ کے امن میں خلل نہ پڑنے پائے لاوال نے
جرمن اسلحہ بندی (REARMAMENT)
سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کر لی اور اطالیہ کے
خلاف تدارکات (SANCTIONS) منظور
کروانے میں انگریزوں کی پوری پوری حمایت کی، اِدھر
اطالیہ کو خوش کرنے اور بحیرہ روم میں جنگ کے خطرہ
سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے حبشہ کے خلاف اطالوی

عزائم کو خندہ پیشانی سے گوارا کر لیا اور مجلس اقوام نے
اجتماعی تحفظ (COLLECTIVE SECURITY)
کا جو نظام قائم کیا تھا اسے درہم برہم کرنے کی در پردہ
کامیاب کوشش کی۔ اس طرح فرانس نے انگریزوں اور
اطالویوں کو بیک وقت راضی کرنے کی جد و جہد میں دونوں
کی ناراضگی مول لی۔ روم اور لندن میں فرانسیسی حکومت
کے خلاف ناراضگی پھیل گئی۔ برلن کی طاقت میں مزید اضافہ
ہو گیا اور فرانسیسی وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ ۷ر مارچ
۱۹۳۶ء کو جب ہٹلر نے معاہدہ لوکارنو کی خلاف ورزی
کر کے رائن لینڈ میں مسلح جرمن فوجیں متعین کر دیں۔ تو
فرانسیسی جنرل اسٹاف نے محسوس کیا کہ اگر جرمنی رائن
لینڈ کی سرحد کو قلعہ بند کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جرمنی
سے جنگ کی صورت میں روس یا چیکوسلواکیہ کو بموجب
معاہدہ امداد پہنچانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس نے تجویز کی
کہ فرانس کو فوراً رائن لینڈ پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ لیکن
اس اقدام سے پہلے فوجوں کا اجتماع عام ضروری تھا
اس کے علاوہ چونکہ اس عمل سے جنگ کا خطرہ تھا اس
لئے انگلستان اور فرانس کے تعلقات میں بدمزگی بھی
پیدا ہو جانی ضروری تھی۔ جنرل گمیلن نے رائن لینڈ پر
قبضہ کر لینے کی تجویز پر اصرار نہیں کیا۔ اس لئے سعرات
کی کابینہ نے کوئی فوجی کارروائی نہیں کی بلکہ صرف
لفظی احتجاج اور رسمی سوال و جواب پر اکتفا کیا۔ بلم
کی کابینہ نے بھی اس توقع پر یہی پالیسی جاری رکھی کہ

رائن لینڈ میں کوئی کارروائی نہ کرنے اور حبشہ کو اطالیہ کے مقابلہ میں تن تنہا چھوڑ دینے کی برطانوی تجویز کی حمایت کرنے سے جرمنی کے خلاف فرانسیسی برطانوی اطالوی اتحاد اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ لیکن یہ امید بھی نقش برآب ثابت ہوئی۔ برطانیہ نے وسطی یورپ کی ریاستوں کے بارے میں کبھی ذمہ داری کو قبول کرنا پسند نہیں کیا اور مسولینی نے فوراً ہٹلر سے سمجھوتہ کر لیا۔"

(ب) اِنگلستان

انگریزوں کی طاقت کا زوال ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد سے شروع ہوتا ہے
اس جنگ سے پہلے انگریزوں کے ملک میں معاشی انتشار اور بدنظمی کے آثار علانیہ نا
پید تھے اور ان کی سلطنت کبھی اتنے پیچیدہ مسائل سے دوچار نہیں ہوئی تھی ۱۹۱۴ء
کے بعد سے انگریزوں کو اپنے ملک اور بیرونی نوآبادیات میں جن مشکلات کا سامنا
کرنا پڑا وہ زیادہ تر جنگِ عظیم کی پیدا کردہ تھیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے
کہ جب انگلستان کا داخلی ہیجان اور اس کی نوآبادیات کا باغیانہ رجحان جنگ
عظیم کا نتیجہ تھا تو انگریزوں کے زوال میں ان کے اپنے اعمال کا کیا دخل ہے۔ اگر
وہ سیاسی بے ایمانیاں، معاشی مظالم اور طبقاتی ناانصافیاں نہ بھی کرتے،
تب بھی انھیں جنگِ عظیم کی بدولت انہیں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس دلیل کا
جواب یہ ہے کہ خود جنگِ عظیم زیادہ تر انگریزوں کی غیر ایماندارانہ سیاست اور
نوآبادیاتی توسیع کی وجہ سے واقع ہوئی۔ اس لئے یہ جنگ انگریزوں کے سابقہ
اعمال کا نتیجہ تھی اور اس کی وجہ سے انھیں جو نقصانات اور پریشانیاں اٹھانی پڑیں
ان کی ذمہ داری بھی انگریزوں کے غلط طرزِ سیاست اور ان کے طریقِ فکر و عمل
کے نقائص پر عائد ہوتی ہے۔

جنگِ عظیم کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے والٹر لینگ سیم[5] اپنی
کتاب (WORLD SINCE 1914.) میں لکھتا ہے:-

"معاشی رقابت جنگِ عظیم کا تیسرا بنیادی سبب تھی
درحقیقت یہ وہ عوامل ان تمام حالات کے ذمہ دار تھے
جن کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر
اور بیسویں صدی کی ابتدا میں منڈیوں کے (MARKETS)

کے حصول۔ خام پیداوار کی تلاش اور ایسے علاقوں پر قبضہ کی فکر جہاں زاید سرمایہ اور آبادی کو کھپایا جاسکے تمام یوروپی ممالک کی سرگرمیوں کا محور و مرکز تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ افریقہ کو یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں نے باہم تقسیم کرلیا۔ مشرق قریب اور ایشیا کے پسماندہ ممالک میں یوروپین طاقتوں کا نفوذ بھی انہیں عوامل کے اثر سے واقع ہوا۔ برطانیہ اور جرمنی کی تجارتی رقابت۔ آسٹریا ہنگری اور روس کی سیاسی آویزش نیز اطالیہ اور آسٹریا ہنگری کی باہمی عداوت بھی اسی جدید معاشی استعماریت (ECONOMIC IMPERIALISM) کی پیداوار تھی۔ اسی جد و جہد اور حریفانہ کشمکش نے بالآخر جنگ عظیم کی صورت اختیار کی۔

یہ قصہ بڑا طویل ہے لیکن یہاں اتنا دینا دینا کافی ہوگا کہ ۱۸۸۰ء کے بعد سے اہل برطانیہ کے دلوں میں یہ خوف بڑھتا ہی گیا کہ عالمی تجارت میں جرمنی ان کے ملک سے بازی لے جائے گا۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان برطانوی ارباب حل و عقد نے جرمنی کے متعلق کئی غیر دانشمندانہ اور غیر محتاط بیانات دیئے جن کی تہ میں یہی خوف اور یہی جذبہ رقابت کام کر رہا تھا۔ انگریزوں کے صنعت کار اور کارخانہ دار بھی اسی فکر میں پریشان تھے کہ کہیں جرمنی کی بڑھتی ہوئی تجارت اور پھیلی ہوئی صنعت ان کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ اس فکر نے انہیں بحری اور تجارتی پروپاگنڈے میں توسیع اور

اضافہ پر آمادہ کیا۔ برطانیہ کے لوگوں پر "ساختہ جرمنی" کا بھوت اس بری طرح سوار تھا کہ یورپ کے امن امان کو اس جنون سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ اسی طرح بلقان میں بڑی بڑی طاقتوں کی معاشی رقابت سے آسٹریا ہنگری روس اور اطالیہ کے مابین نفرت و عداوت کے جذبات پرورش پاتے رہے۔

جنگ عظیم کا ایک اور سبب یہ تھا کہ بین الاقوامی تعلقات کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی مشنری نہیں موجود تھی۔ اس بین الاقوامی سراج کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ تھا کہ حکومتیں ایک دوسرے سے خفیہ معاہدات کر لیتی تھیں اور عوام کے نمائندوں یا پارلیمنٹ کے ارکان کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کی حکومتوں نے باہم کون سے فوجی اور سیاسی سمجھوتے کر رکھے ہیں۔ ۳ر اگست ۱۹۱۴ء کو سر ایڈورڈ گرے نے پارلیمنٹ میں علانیہ اس بات کا انکار کیا کہ ایوانِ عام کی آزادی پر کوئی پابندی یا تحدید ہے حالانکہ اسی درمیان میں برطانوی حکومت نے فرانس سے کئی اہم معاملات پر خفیہ سمجھوتے کیے۔ یہی خفیہ سیاسی کارروائیاں اور یہی بین الاقوامی لاقانونیت اس صورت حال کی بھی ذمہ دار تھی جس کا ذکر آرتھر پالنسبی نے ۱۹۲۷ء میں ایک تقریر کے دوران میں کیا جبکہ اس نے ایوان عام کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ جعلسازی۔ چوری۔ جھوٹ۔ رشوت ستانی اور بددیانتی دنیا کے تمام ممالک کے دفاتر خارجہ (FOREIGN OFFICES) میں دور دورہ

سے جاری ہے۔"

سیاسی بے ایمانیاں

یورپی اقوام کا سیاسی اخلاق جنگِ عظیم کے زمانہ تک کتنا خراب ہو چکا تھا۔ اس کا حال ان خفیہ معاہدات سے ظاہر ہوتا ہے جو مختلف ممالک نے عوام کے علم و اطلاع بغیر ایک دوسرے سے طے کر لیے تھے۔ جنگِ عظیم سے پہلے انگریز اور فرانسیسی اطالیہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے۔ اور آسٹریا ہنگری اپنی طرف چنانچہ اطالیہ اور آسٹریا ہنگری میں ابھی گفت و شنید ہو رہی تھی کہ فرانس، انگلستان اور روس نے ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء کو بمقام لندن اطالیہ سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا جس کے تحت اطالیہ سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ متحدین کے ساتھ شریک جنگ ہو تو اس کو ڈالمیشیا (DALMATIA) ٹریسٹی (TRIESTE) اور جزائر ڈوڈی کینیز دیدیئے جائیں گے۔ حالانکہ ان علاقوں کی آبادی غیر اطالوی اقوام پر مشتمل تھی اور اطالیہ کو ان پر کوئی اخلاقی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یونان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے جواب تک غیر جانبدار تھا۔ متحدین نے البانیہ اور ترکی کے بعض علاقوں کو اس کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا اور لطف کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کچھ علاقوں کے بارے میں اطالیہ سے پہلے ہی وعدہ کیا جا چکا تھا کہ وہ اس کو دے دیئے جائیں گے۔ اس طرح انگریز، فرانسیسی اور روسی اپنے حلیفوں ہی کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری عالمگیر جنگ جن اسباب سے وقوع پذیر ہوئی اس میں برطانیہ کی غلطیوں اور اخلاقی کمزوریوں کا بڑا حصہ تھا۔ اگر برطانیہ کمزور اقوام کے حقوق کی حفاظت اور مدافعت میں تساہل سے کام نہ لیتا اور بڑھتی ہوئی طاقت کو خوش رکھنے کی کوشش میں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے ساتھ ناانصافی نہ کرتا تو دوسری جنگِ عظیم کا برپا ہونا دشوار تھا جس کے نتیجہ میں انگلستان زوال و انحطاط کے

آخری درجہ پر پہنچ گیا۔ برطانیہ کی غلط اور خود غرضانہ سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے شومین[1] (FREDERICK SCHUMAN) لکھتا ہے:—

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ واٹرلو کی لڑائی ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو اس میں بھی کلام نہیں کہ سوا سو سال کے بعد اسپین آسٹریا۔ چیکوسلاویکیہ۔ پولینڈ اور فرانس میں ہٹلری افواج کی فتوحات کا سنگ بنیاد بھی ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں رکھا گیا۔ برطانیہ کے اعلیٰ طبقات اور متمول خاندانوں کے افراد کی تنگ نظری اور کور چشمی جو پبلک اسکولوں کی پیداوار تھے۔ اس کے بعد از جنگ مصائب کی بانی مبانی تھی نہ کہ برطانوی عوام کی جہالت اور صوبہ واریت۔ فرانس کے برعکس انگلستان میں اشترا کی تحریک کی کوئی منظم طاقت نہیں تھی جس سے دولتمند اشخاص کو خوف ہوتا۔ مزدور پارٹی رامزے میکڈانلڈ کی کنارہ کشی کے بعد سیاسی حیثیت سے کمزور ہو چکی تھی۔ جمہوریت پسند گروہ (LIBERALS) کا اثر بھی تقریباً صفر کے برابر تھا۔ بیس سال کی اس منحوس مدت میں پریشان دماغ انتخاب کنندوں (ELECTORATE) نے اپنی قسمت قدامت پسند پارٹی کے انتہائی رجعت پرست عناصر کے حوالہ کر دی جو ۱۹۳۱ء کی بدبخت قومی حکومت پر حاوی تھی۔ سیاسی اندھوں کی اس حکومت

---

[1] INTERNATIONAL POLITICS BY FREDERICK. L.SCHUMAN (۸۳۵) صفحہ

نے صرف مئی سنہ ۱۹۴۰ء میں جبکہ انگریزوں کی کشتی
حیات ڈگمگانے لگی دوسرے لیڈروں کے لئے جگہ
خالی کی۔

اس سوال کے کئی جواب دئیے جاتے ہیں۔ کہ
برطانیہ کے لیڈروں نے گزشتہ واقعات سے
کیوں سبق نہیں لیا اور اپنے ملک کو دوبارہ ایک
عالمگیر جنگ کے مصائب میں کیوں مبتلا کر دیا لیکن
یہ تمام جوابات سطحی اور ظاہری باتوں پر مبنی ہیں۔ اصل
واقعہ یہ ہے کہ معاہدہ ورسائی کے بعد برطانیہ کے
تحفظ کے صرف دو ہی طریقے تھے یا تو وہ توازن
قوت کے اصول سے دستبردار ہو کر مجلس اقوام کی
پوری پوری حمایت کرتا اور اس کو ایک طاقتور اور
حقیقی مجلس امن بنا دیتا۔ یا اسے اپنی سابقہ پالیسی
کے مطابق براعظم یورپ کی کمزور ریاستوں کو طاقتور
سلطنتوں کے مقابلہ میں مدد دینی چاہیئے تھی
اول الذکر طریقہ کار اختیار کیا جاتا تو برطانیہ
کو لیئے بڑی وسیع ذمہ داریاں لینی پڑتیں اور
پیش عزم کر لینا پڑتا تاکہ وہ ان ذمہ داریوں سے
بہر صورت عہدہ برآمد ہو کر رہے گا۔ دوسرا طریق
کار اختیار کرنے کی صورت میں برطانیہ کے لئے
ضروری ہوتا کہ جرمنی کو دوبارہ فوجی طاقت بڑھانے
سے روک سکنے کے لئے وہ معاہدہ ورسائی کے فوجی
دفعات کا نفاذ عمل میں لاتے یا اگر یہ نہ ہو سکتا

تو اسے پولینڈ، چیکوسلاویکیہ اور فرانس کی پوری پوری
حمایت کرنی چاہیئے تھی اور محوری طاقتوں کے توسیعی
اقدامات کا راستہ مسدود کرنے کے لئے روس سے
قرار واقعی سمجھوتہ کرنا چاہیئے تھا۔ برطانوی حکومت
نے ان دونوں میں سے کوئی طریق کار بھی نہ اختیار
کیا۔ اس نے مجلس اقوام کی حمایت تو کی مگر بے دلی سے
اور آخر کار محوری طاقتوں کو منانے کی سعی ناکام میں
اس مجلس کو بالکل ناکارہ اور بے اثر کر دیا اس نے
جرمنی کے جمہوری دور میں فرانس کے مقابلہ پر جرمنوں
کی مدد کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فرانس میں پوانکیرے
(POINCARE) حکمران تھا اور جرمنوں کے ساتھ
بڑی سختی سے پیش آرہا تھا۔ بعد کے زمانہ میں جب
فرانس میں بارتھو (BARTHOU) اور بلم (BLUM)
کی حکومتیں برسر اقتدار آئیں تو برطانیہ نے ہٹلر کی
تائید کی۔ دوسری طرف برطانوی حکومت نے اپنی
حماقت آمیز پالیسی سے روس کی ہمدردیاں کھو
دیں۔ اور آسٹریا، چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ کی
مدافعت کے بارے میں اس پر جتنی ذمہ داریاں
عائد ہوتی تھیں ان سب سے کنارہ کشی اختیار کی
برطانیہ کے اہل الرائے یہ سمجھتے تھے کہ جاپان اور
اور روس مشرق میں اور جرمنی اور روس مغرب میں
ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں گے۔ اگر
ان طاقتوں میں باہم لڑائی چھڑ جاتے تو برطانیہ ان

سب سے علیحدہ رہ کر اپنی حفاظت کر سکتا ہے ایسی
حالت پیدا ہو جائے تو اس کے لئے صرف فرانس پر
دباؤ ڈالنا ضروری ہوگا۔ تاکہ وہ لقان میں جرمنی کی
راہ نہ روکے اور اپنے لقانی حلیفوں کی امداد سے
دستکش ہو جائے جو مشرقی یورپ میں جرمنی کے
منصوبوں کے مخالف تھے۔ ایک مفروضہ یہ تھا کہ
انقلابی کمیونزم سلطنت برطانیہ کی حفاظت اور برطانوی
حکمران طبقہ کے وجود کے لئے سب سے زیادہ خطرناک
اور مہلک ہے۔ اگر جرمنی۔ جاپان اور اطالیہ اس
خطرہ کی مدافعت کے لئے تیار ہوں تو برطانیہ کو روس
کا مقاطعہ کر کے مثلاً مسولینی اور جاپانی حکومت کی حمایت
کرنی چاہئے البتہ اس میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ اگر محوری
طاقتیں روس کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ
سلطنت برطانیہ کو بھی ہضم کر سکتی ہیں۔ لیکن
کمیونزم کے پھیلاؤ اور تسلط کے مقابلہ میں یہ خطرہ
موہوم تھا۔ ان مفروضات کی بنا پر برطانیہ نے محوری
طاقتوں کی جارحانہ کارروائیوں کو سکوت کے ساتھ
برداشت کیا بلکہ حتی الامکان ان طاقتوں کی دلجوئی
اور حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا۔

اس طرز استدلال کی ایک مثال ہمیں فورٹ نائیٹلی ریویو
(FORTNIGHTLY-REIEW.) کے ایک مضمون میں ملتی ہے جسے ۱۹۳۷ء
مسٹر لاتھن نے سپرد قلم کیا تھا۔ یہ مضمون نگار لکھتا ہے:۔
گذشتہ زمانہ کے جرمن سیاستدان مشرق

ومغرب دونوں پر للچائی ہوئی نظریں دوڑایا کرتے تھے۔
لیکن ہٹلر اب صرف مشرق سے سروکار رکھنا چاہتا ہے۔
جو شخص بھی مشرقی یورپ کے نقشہ کا گہری نظر سے مطالعہ
کرے گا اُسے یہ محسوس ہوگا کہ جرمنی اور پولینڈ کی مصاحبت
میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔ یہ منصوبہ یقیناً
نہایت دلکش ہے کہ صوبہ یوکرین (UKRAINE)
کو یورپی نظام میں داخل کرکے روس کو مشرق کیطرف
ڈھکیل دیا جائے۔ اگر یوکرین یورپ کے جمہوری وفاقی
نظام کا ایک جزو بن جائے تو سلطنتوں کا ایک
ایسا مجموعہ پیدا ہو سکتا ہے جس کے ساتھ برطانیہ کے
تعلقات نہایت خوشگوار اور دوستانہ ہوں گے
مشرقی یورپ میں اس قسم کے ریاستی نظام کی تشکیل کے
لئے موجودہ وقت نہایت سازگار معلوم ہوتا ہے۔
مسٹر ایل۔ ایس۔ ایمری سابق وزیر نوآبادیات نے فارورڈ۔ (FORWARD-
REVIEW) میں ایک مضمون لکھتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی:۔

یورپ میں امن دائمی قائم رکھنے کے لئے پہلا
ضروری امر یہ ہے کہ اب اس بات کو علانیہ طور پر تسلیم
کرلیا جائے کہ جرمنی کی اسلحہ بندی (REARMAMENT)
اس کا اپنا خانگی معاملہ ہے جس میں کسی اور طاقت کو
دخل دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ہے۔ وقت آ گیا
ہے کہ مجلس اقوام کے دستور پر نظر ثانی کی جائے اور
ان تمام فقرات اور دفعات پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے
جن سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجلس ایک طرح کی بین

الاقوامی حکومت ہے جس کا دائرہ اختیار دوسری
حکومتوں پر با فوق ہے۔ یہ خیال مہمل ہے کہ ایک جگہ
لڑائی شروع ہو تو دوسرے تمام ممالک اس کی
لپیٹ میں ضرور آجائیں گے ...... ہم اپنے آپ کو
ایک یورپی قوم نہیں سمجھتے ہیں اگر جاپان سائیبریا میں
مداخلت کرے یا روس کے کسی حصہ پر قابض ہو جاتے
تو ہمیں انکی الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مارکوئس آف لنڈنری جو ایک بڑا انگریز جاگیردار اور کئی زرخیز کانوں کا مالک تھا اپنی کتاب (OURSELVES AND GERMANY) شائع شدہ ۱۹۳۸ء میں لکھتا ہے:-

ہمارا دفتر خارجہ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ فرانس
کی دوستی کی وجہ سے ہم بالواسطہ کمیونزم اور بالشوزم
کو تقویت دے رہے ہیں۔ اور جرمنی اطالیہ اور جاپان
کے صحیح تر رویہ کو جو کمیونزم سے عداوت کی پالیسی پر مبنی
ہے ہم مسلسل ٹھکرا رہے ہیں۔ بالشوزم ایک عالمگیر
عقیدہ ہے جو ہر ملک کے اندرونی نظام کو تہ و بالا کر کے
ایک عالمی حکومت بنانا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں
اس حقیقت سے روگردانی کی جا رہی ہے کہ جرمنی
اطالیہ اور جاپان اس عقیدہ کے سخت ترین دشمن
ہیں۔ ہم اس امر سے بھی تجاہل برت رہے ہیں کہ اسپین
کا موجودہ ہیجان بالشویکوں کی سازش کا نتیجہ ہے
ہم یہ سمجھ کر اپنے دل کو تسلی دے دیتے ہیں کہ فرانس
کے کاشتکار طبعاً قدامت پسند ہیں۔ اس لئے فرانس

میں کمیونزم کی اشاعت اور پھیلاؤ کا کوئی خطرہ نہیں، حالانکہ فرانسیسی پارلیمنٹ میں کمیونسٹوں کے نمائندوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ جیسا کہ دو برس ہوئے ہٹلر نے مجھ سے پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا۔ بلجیم میں بھی کمیونزم کے بڑھنے کے آثار موجود ہیں۔ خود جرمن محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ملک کمیونسٹوں کی زد میں ہے۔ ہم ان تمام باتوں کو خاموشی سے دیکھتے جا رہے ہیں اور اسپین میں عدم مداخلت کے اصول پر عمل کر کے بالواسطہ کمیونسٹوں کو امداد بہم پہنچا رہے ہیں اور جب اس صورتِ حال کے باعث اطالیہ اور جرمنی ہمارے خلاف اظہارِ ناخوشی کرتے ہیں تو ہم ان کی روش کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہم کمیونزم کے خلاف جرمنی کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ محاذ کیوں نہیں قائم کرتے۔ ایسا مخالف کمیونسٹ محاذ اب بھی ہمارے لئے نہایت گرانقدر ثابت ہو سکتا ہے۔

اجتماعی عدم تحفظ

سنہ ۱۹۳۱ء کے بعد ایک صاف سیدھی روش اختیار کرنے کے بجائے برطانوی حکومت نے بین الاقوامی معاملات میں نہایت غیر امیدوارانہ اور غیر شریفانہ حکمتِ عملی اختیار کی جس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جبکہ سر جان سائمن نے منچوریا پر جاپانی حملہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ جاپان کو منچوریا ہڑپ کر جانے کا پورا پورا موقعہ دیا۔ اس کے بعد اسی پالیسی کے تحت چیمبرلین نے

نے حبشہ۔ اسپین۔ آسٹریا اور چیکوسلواکیہ کو فاسسطی آمروں کی نذرگاہ پر قربان
کردیا۔ یہ ساری پالیسی برطانیہ کے رجعت پسند یا اہل زر طبقہ کی ذہنی پیداوار تھی۔ مزدور
جماعت کی دوسری کابینہ جس کی تشکیل ۱۹۲۹ء میں عمل میں آئی اور جس میں
رامزے میکڈانلڈ وزیراعظم کے عہدہ پر فائز تھا ۱۹۳۱ء کے اقتصادی بحران
کی بدولت ٹوٹ گئی اس کی جگہ ایک قومی حکومت قائم ہوئی جس میں اکثریت
قدامت پرستوں کی تھی۔ لیکن اس کابینہ کا وزیراعظم بھی رامزے میکڈانلڈ
تھا جو مزدور پارٹی کی مخالفت کے باوجود اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قدامت
پرستوں سے اشتراک عمل کررہا تھا۔ مزدور جماعت نے بالآخر رمزے میکڈانلڈ
اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو غدار قرار دے کر اپنی پارٹی سے نکال دیا۔ اس
طرح قومی وزارت کے مزدور ارکان کو ملک کے کسی حصہ کی تائید حاصل نہ تھی۔
اکتوبر ۱۹۳۱ء کے انتخابات میں قومی حکومت کے حامیوں کو بڑی زبردست کامیابی
ہوئی اور ایک بڑی مدت تک برطانیہ کی خارجی حکمت عملی اسی وزارت کے ہاتھ میں
رہی۔ رامزے میکڈانلڈ نے ۷ جون ۱۹۳۵ء کو قومی حکومت کی وزارت سے استعفا
دے دیا اور اس کی جگہ بالڈون جو قدامت پسندوں کا لیڈر تھا وزیراعظم بن گیا اس
کی نئی کابینہ ظاہری شکل کے اعتبار سے ایک مشترکہ حکومت (COALITION)
تھی لیکن عملاً اس کی باگ ڈور قدامت پسندوں کے ہاتھ میں تھی۔

فاسسطی آمروں کے مقابلہ میں صلح جوئی (APPEASEMENT) کی جو
پالیسی اس حکومت نے اختیار کی اس کے وجوہ و اسباب پر روشنی ڈالی جا چکی ہے
ابتدا میں برطانیہ کے عوام علانیہ طور پر اس پالیسی کے مخالف تھے لیکن آخرکار انھیں
دھوکہ، فریب اور کذب و دروغ سے اس کی تائید کرنے پر مجبور کردیا گیا وہ کبھی یہ سمجھ
کر چاروناچار اس پر رضامند ہوگئے کہ شاید اس پالیسی کی بدولت جنگ کا خطرہ ٹل
جائے۔ ابتداء میں جس وقت کہ قدامت پسندوں کو یہ حکومت برسراقتدار آئی اس وقت
برطانوی رائے عامہ کا کیا رجحان تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ۱۹۳۴-۳۵ء میں

لارڈ رابرٹ سیسل کے تحت برطانیہ کی مجلس اقوام یونین (BRITISH - LEAGUE OF NATIONS UNION.) نے قیام امن کے بارے میں عوام کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ایک رائے شماری کی جس میں ایک کروڑ پندرہ لاکھ افراد نے رائے دی۔ اس رائے شماری میں ایک بہت بڑی اکثریت نے تخفیف اسلحہ اور مجلس اقوام کی چیدہ ورانہ کی پالیسی اختیار کرنے کی حمایت کی اسی طرح ایک بھاری اکثریت نے فاسسطی آمروں کے جارحانہ اقدامات کے خلاف معاشی اور فوجی تدارکات کے استعمال کی پالیسی کو پسند کیا۔ بالڈون نے اس نتیجہ رائے دہی کو عوام کے احساسات کا صحیح ترجمان قرار دے کر ایک تقریر میں کہا "ہم عوام کی اس تائید کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اپنی پارک شائر والی تقریر میں بتا چکا ہوں۔ ہماری خارجی حکمت عملی کی بنیاد اب بھی یہی ہے۔ کہ مجلس اقوام کو قوی سے قوی تر بنایا جائے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں قومی حکومت کے انتخابی منشور میں بتایا گیا تھا کہ "مجلس اقوام اب بھی برطانوی حکمت عملی کا سنگ بنیاد رہے گی۔ مجلس کے دستور اور اس کے میثاق (COVENANT) کی ہم پوری پوری حمایت کریں گے۔ اس میں کسی قسم کا تذبذب یا لیت و لعل نہیں ہوگا۔" قدامت پسند پارٹی کے ایک انتخابی پوسٹر میں بالڈون کی تصویر بنائی گئی تھی اور اس میں یہ منظر پیش کیا گیا تھا کہ بالڈون میثاق مجلس اقوام پر نگاہ رکھے ہوئے یہ کہہ رہا ہے۔ کہ "ہمارے الفاظ باقاعدہ معاہدوں سے زیادہ قابل وثوق ہیں۔ نومبر ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں قومی حکومت نے ایوان عام کی (۶۱۵) نشستوں میں سے (۴۳۱) نشستیں جیت لیں۔ یہ انتخابی کامیابی درحقیقت عوام کی اس توقع کا نتیجہ تھی کہ قومی حکومت برسر اقتدار آنے کے بعد مجلس اقوام کی پوری پوری حمایت کرے گی اور جارحانہ اقدام پسندوں (AGRESSORS.) کی سرکوبی کے لئے وہ مجلس اقوام کے زیر سیادت معاشی اور فوجی تدارکات کی مشینری کو استعمال میں لائیگی قومی حکومت کے طرفداروں نے ان سے وعدہ بھی یہی کیا تھا۔ لیکن رائے دہندوں

کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سر سموئیل ہور اور لاوال کے درمیان ستمبر میں بمقام جنیوا ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ یہ دونوں حبشہ اور مجلس اقوام کے ساتھ غداری کریں گے اور یہ کہ انتخاب کے تین ہی ہفتہ بعد ایک اس سے بھی زیادہ شرمناک سودے کا راز افشا ہوگا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ چار سال تک برطانوی لیڈروں کی اس ٹولی نے جسکو عوام نے اس شرط پر اقتدار عطا کیا تھا کہ وہ جارحانہ اقدام کرنے والی حکومتوں کو منہ توڑ جواب دینگے اور عالمی امن وامان کو برقرار رکھنے کی پوری پوری جد وجہد کرینگے حملہ آوروں اور دشمنان امن کی جارحانہ کارروائیوں سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی پالیسی اختیار کی جس سے ساری دنیا میں ایک انتشار پیدا ہونا یقینی تھا۔ ان لیڈروں نے امن وامان کے نام پر مخالف امن طاقتوں کو امداد وتقویت پہنچائی۔

منچوریا کے معاملہ میں جاپان کے ساتھ جو مداہنت برتی گئی۔ اس کو ایک نظیر قرار دے کر ان برطانوی لیڈروں نے اطالیہ کے ساتھ حبشہ کے معاملہ میں۔ جرمنی کے ساتھ رائن لینڈ کے معاملہ میں اور محوری طاقتوں کے ساتھ اسپین کے معاملہ میں نرمی اور دلجوئی کا سلوک کیا۔ ہر مرتبہ رائے عامہ کے کسی نہ کسی نمائندہ نے اس پالیسی کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ اور ہر مرتبہ ایسے احتجاجات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ دشمن امن طاقتوں کے ساتھ مداہنت کرنے والے لیڈروں نے ہر بار پارلیمنٹ اور پبلک کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے فیصلوں سے قیام امن اور زیادہ یقینی ہو جائے گا۔ قدامت پسندوں کے لیڈروں نے اپنی پالیسی کے جواز میں کہنا شروع کیا کہ مجلس اقوام بہت کمزور ادارہ ہے۔ اس لئے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مجلس اقوام کی تائید کرنے کا تصور بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ کیونکہ اس سے جنگ یقینی طور پر چھڑ جائے گی۔ مسولینی سلطنت برطانیہ۔ فرانس۔ یوگوسلاویہ۔ یونان یا ترکی پر حملہ کر دے گا۔ چیمبرلین نے ۱۰ ؍جون ۳۶ء کو ایک تقریر کے دوران میں کہا "کیا

یہ ظاہر نہیں ہے کہ تدارکات (SANCTIONS.) کے استعمال سے جنگ کا خطرہ قریب تر آجائے گا۔ حقائق سے آنکھیں بند کر لینے سے کیا فائدہ۔" ۱۸ جون کو ایڈن نے اعلان کیا کہ تدارکات کے استعمال کو ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا "میرے خیال میں مجلس اقوام کا ایک رکن بھی ایسا نہیں جو فوجی طاقت کے استعمال پر راضی ہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ حبشہ کی آزادی کے تحفظ کی خاطر ہمارا ایک جہاز بھی جنگ میں ضائع ہو۔" حکومت کے ارکان نے حزب مخالف سے پارلیمنٹ میں چلا کر پوچھا "کیا تم محوری طاقتوں سے لڑائی مول لینے پر تیار ہو۔" لارڈ سیسل نے لندن ٹائمس میں لکھتے ہوئے کہا "ہم لڑائی سے اس طرح نہیں بچ سکتے ہیں کہ ہر مرتبہ جنگ کے خطرہ سے خوفزدہ ہو کر دشمن کے سامنے جھک جائیں یا اس کے شرائط مان لیں۔ اگر آج ہم چوروں سے ڈر کر دوسروں کا مال ان کے حوالہ کر دیں گے تو کل کے دن وہ ہمارے مال و اسباب پر دست درازی کریں گے اور ہم خاموشی کے ساتھ اسے برداشت کر لیں گے۔" چرچل کی آواز کی طرح سیسل کی آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

۱۹۳۸ء تک حالت یہ ہو گئی کہ محوری طاقتوں کے ہر اقدام پر برطانوی حکومت عاجزانہ سر نیاز خم کرنے لگی۔ ایڈن نے تنگ آکر برطانوی کابینہ سے استعفا دے دیا۔ آسٹریا پر جرمنی کے کامیاب اقدام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت اس کمزور ملک کی مدد کرنے پر تیار نہ تھی۔ جب ہٹلر نے آسٹریا پر آناً فاناً قبضہ کر لیا تو لارڈ ہیلی فیکس دم بخود ہو کر کہنے لگا۔ "یہ کیسی خوفناک حرکت ہے، ہم نے یہ کبھی نہیں سمجھا تھا کہ یہ لوگ ایسا خوفناک اقدام کریں گے۔" لیکن جب ۱۷ مارچ کو روسی وزیر خارجہ لیٹوینوف (LITINOV.) نے برطانیہ کو خبردار کیا کہ اب کی چیکوسلاویکیہ کی باری ہے تو برطانوی حکومت نے اسکی یہ تجویز ٹھکرا دی کہ مجلس اقوام کی ارکان حکومتوں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک مشترکہ کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جائے جو اس بات پر غور کرے کہ آئندہ کیلئے

جارحانہ اقدامات اور امن شکن کارروائیوں کا سدِ باب کیونکر کیا جائے۔ جس سے جنگ کا خطرہ رفع ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد میونخ (MUNICH.) کا قضیہ پیش آیا۔ برطانوی حکومت نے چیکوسلاواکیہ کو دھمکیاں دے کر اسے ہٹلر کے آگے جھک جانے پر مجبور کر دیا۔ چیمبر لین میونخ سے واپس آیا تو اس کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوا اور ساری قوم نے اُسے ایک نجات دہندہ سمجھ کر خوش آمدید کہا۔ کابینہ کا صرف ایک رکن مسٹر ڈف کوپر اس ذلت کو برداشت کر سکا اور وزارت سے مستعفی ہو گیا۔ ایوان عام میں بیان دیتے ہوئے اس نے کہا "ہم ۱۹۱۴ء میں بلجیم یا سربیا کے لئے نہیں لڑے تھے بلکہ ہم اس وقت اس غرض سے لڑ رہے تھے کہ کسی ایک بڑی طاقت کو سارے یورپ پر اپنا اقتدار جمانے کا موقع نہ حاصل ہونے پائے اور کسی حکومت کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی کر کے محض اپنی فوجی طاقت کے بل پر من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ اسی بات کے لئے ہمیں ایک ہفتہ پیشتر جرمنی سے لڑنا چاہیے تھا۔ میں نے میونخ کے تلخ شرائط کو نگلنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے حلق سے نیچے نہ اتر سکے۔" چرچل نے تقریر کرتے ہوئے کہا "ہمیں ایک بڑی زبردست اور کامل شکست ہوئی ہے۔ اس وقت انگلستان اور فرانس ایک بڑی مصیبت سے دوچار ہیں۔ ہمیں حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں۔" ان آوازوں کا برطانوی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایوان نے (۱۴۴) آرا کے مقابلہ میں (۳۶۶) آرا سے چیمبر لین کی تائید کی۔ وزیر اعظم اطمینان کے ساتھ مچھلیوں کا شکار کھیلنے اسکاٹ لینڈ چلا گیا۔

بالآخر جب یہ ظاہر ہو گیا کہ ہٹلر اور مسولینی کی خدمت میں انگلستان اور فرانس نے جو نذرانے پیش کئے تھے۔ ان سے ان دونوں کے توسیعی اقدامات اور جنگی منصوبوں میں کوئی فرق نہ آسکے گا۔ تو اب آخری لمحہ میں جرمنی اور اطالیہ کے خلاف ایک متحدہ فوجی محاذ بنانے کی کوشش شروع کی گئی۔ ۳۱ر مارچ ۳۹ء

کو چیمبرلین نے ایوانِ عام میں اعلان کیا کہ پولینڈ کی خود مختاری کو خطرہ میں ڈالنے والی کوئی کارروائی عمل میں آئی تو برطانوی حکومت پولینڈ کو پوری پوری مدد دے گی۔ جس سال میں پہلی مرتبہ برطانیہ نے مشرقی یورپ کی ایک حکومت سے دفاعی معاہدہ کیا جبکہ صورتِ حال اتنی نازک ہو گئی تھی۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۳۹ء کو اطالیہ نے البانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا اعلان کیا اس کے بعد فوراً ہی چیمبرلین نے رومانیہ۔ یونان اور ترکی سے وعدہ کیا کہ اگر ان پر کوئی طاقت حملہ آور ہو گی تو برطانیہ ان کی پوری پوری مدد کرے گا۔

اِن فوجی معاہدات میں بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان میں جغرافیائی اور ریاضیاتی حقائق کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ پولینڈ۔ رومانیہ اور ترکی کو اگر کوئی طاقت ہٹلر اور مسولینی سے بچا سکتی تھی تو وہ انگلستان اور فرانس نہیں بلکہ روس تھا۔ لیکن چیمبرلین نے روس سے گفت و شنید کے بغیر ان ملکوں سے معاہدے کر لئے اور جب اسٹالن نے روسی امداد کی پیش کش کی تو اس نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ پھر جب یہ پالیسی بھی ناکام ہوتی نظر آئی تو ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں قدامت پسندوں کے لیڈروں نے روس سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اسی قدیم صلح جوئی کی پالیسی پر کاربند ہونے کی کوشش کی۔ اور برطانوی حکومت کے ترجمانوں نے پھر ایک مرتبہ اعلان کیا کہ وہ ہٹلر اور مسولینی سے تمام متنازعہ فیہ مسائل کو گفت و شنید اور امن پسندانہ مصالحت کے ذریعہ طے کرنے پر تیار ہیں۔ مئی میں چیمبرلین اور سر جان سائمن نے ہٹلر کو دس لاکھ پونڈ کا وہ سونا حوالہ کر دینے کی اجازت دے دی جو چیکوسلاویکیہ نے لندن میں جمع کر رکھی تھی۔ جولائی میں سر ہوریس ولیم اور رابرٹ ایس۔ ہڈسن نے ہٹلر کے اقتصادی مشیر کے ساتھ جرمنی کو ایک ارب پاؤنڈ کا برطانوی قرضہ دینے کے مسئلہ پر گفت و شنید کی اگرچہ ساتھ ہی چیمبرلین نے یہ اعلان کیا کہ ان مباحث کی نوعیت غیر سرکاری ہے۔ جرمنی کے ساتھ ان دوستانہ مراسم نے ان لوگوں کی بے اطمینانی میں اور اضافہ کر دیا۔ جو ہٹلر اور مسولینی کے خلاف ایک طاقتور سیاسی اور عسکری محاذ قائم کرنا چاہتے تھے ستم بالائے ستم یہ کہ برطانوی

حکومت نے اپنے حلیف پولینڈ کو جسے اس نے جرمن حملہ کی صورت میں فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک مطلوبہ قرضہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک پولینڈ کی حکومت اس رقم کو انگلستان کے اندر ہی خرچ کرنے پر راضی نہ ہو گی۔ اس وقت تک ہم اسے قرضہ نہیں دے سکتے ہیں۔

محوری طاقتوں کو روکنے میں صرف ایک حکومت یعنی روس کی امداد مفید مطلب ہو سکتی تھی۔ لیکن روس کے ساتھ برطانوی حکومت کی گفت و شنید کی ناکامی غیر متوقع نہ تھی۔ کیونکہ برطانیہ کی قیادت پر جو لوگ فائز تھے وہ روس سے دوستی نہیں چاہتے تھے۔ لائیڈ جارج اور چرچل اور دوسرے حقیقت پسند رہنماؤں نے بار بار برطانوی حکومت کو متنبہ کیا کہ قیام امن کی تمام کوششیں بالکل رائیگاں جائیں گی۔ اگر محوری طاقتوں کے خلاف روس کی امداد نہ حاصل کی گئی۔ لیکن چیمبرلین اور لارڈ ہیلی فیکس روس کی امداد سے بدستور مخالف رہے روس کے خلاف جو تعصبات ان کے دلوں میں جم گئے تھے ان سے خلاصی پانا ایک امر دشوار تھا۔ مارچ میں لیٹونوف روسی وزیر خارجہ نے محوری طاقتوں کے خلاف ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کی تھی لیکن برطانوی حکومت نے اس تجویز کو بھی ٹھکرا دیا۔ اپریل کے وسط تک روس کے ساتھ کوئی گفتگو عمل میں نہیں آئی۔ کیونکہ برطانوی حکومت فاسسٹی آمروں کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ۳ مئی کو لیٹونوف جو کہ برطانیہ اور فرانس سے روس کی دوستی کا حامی تھا۔ وزارت خارجہ کے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ لیکن برطانیہ کے حکمرانوں پر اس واقعہ کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

اس کے بعد روس کے ساتھ ایک طول طویل گفتگو شروع ہوئی جو پانچ ماہ تک جاری رہی۔ روس چاہتا تھا کہ برطانیہ اس سے ایک مستقل دفاعی معاہدہ کرے اور اس معاہدہ کے ارکان یا بالٹک کی ریاستوں پر کوئی جارحانہ حملہ ہو تو سب کے سب مل کر اس حملہ آور کا مقابلہ کریں۔ روس نے یہ بھی کہا کہ فوجی نقطہ نظر سے پولینڈ کو امداد پہنچانا اسی صورت میں ممکن ہے جب روسی فوجوں کو لڑائی کی حالت میں پولینڈ کے علاقہ میں داخلہ کی اجازت ہو لیکن چیمبرلین اور لارڈ ہیلی فیکس جنہوں نے چین، حبشہ، آسٹریا، چیکوسلاواکیہ اور البانیہ

کو فاسسطی آمروں کی نذر گاہ پر قربان کر دیا تھا۔ اب یکایک چھوٹی قوموں کی آزادی کے تحفظ کا دم بھرنے لگے۔ برطانیہ کا عذر یہ تھا کہ بالٹک کی ریاستیں بڑی طاقتوں سے کسی قسم کی فوجی ضمانت نہیں چاہتی ہیں۔ اس لئے ایسی فوجی ضمانت دینا اس کے لئے نامناسب ہوگا۔ اسی طرح چونکہ پولینڈ کے حکمران روس کی امداد طلب کرنے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ اپنے ملک کو ہٹلر کے حوالہ کر دیں اس لئے برطانوی حکومت اس پر بھی راضی نہ ہوئی کہ روس پولینڈ کی فوجی امداد کرے۔ بالآخر پانچ ماہ کی لایعنی گفتگو کے بعد روسی برطانوی تحالف (ALLIANCE) کی تجویز ناکام رہی لیکن ایسے حلیفانہ معاہدہ کی ضرورت برطانیہ کو تھی نہ کہ روس کو۔ اسٹالن کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے شرائط پر برطانیہ یا فرانس سے معاہدہ کرتا جنہیں وہ ناقابل عمل خیال کرتا تھا۔ روس کے غیر جانبدار رہنے کی صورت میں ہٹلر سے وہ سب کچھ دینے پر تیار تھا جو برطانیہ روس کے ساتھ فوجی معاہدہ کرنے کے بعد بھی اسے دینا نہیں چاہتا تھا، باوجودیکہ چیمبرلین اور دلادیہ نے علانیہ کہا کہ انہیں روسی جرمن گفت وشنید کا کوئی علم نہیں ہے۔ مئی اور جون ہی میں ان دونوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ روس اور جرمنی سے ایک معاہدہ کی بابت خفیہ بات چیت ہو رہی ہے۔ لیکن اس عظیم ترین خطرہ کے وقت بھی یہ دونوں روس کے شرائط معاہدہ ماننے یا اس کے ساتھ فوجی تحالف کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے اسٹالن نے آسان تر راہ اختیار کی اور ۲۳ اگست کو جرمنی اور روس کے درمیان ایک معاہدہ عدم تشدد عمل میں آگیا۔ جس کی وجہ سے ہٹلر کی عظیم الشان فوجی طاقت کے مقابلہ میں برطانیہ اور فرانس میدان میں بالکل تنہا رہ گئے۔

برطانیہ نے جن حالات میں جرمنی کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اس سے زیادہ اندیشناک حالات میں اسے کبھی جنگ کرنی نہیں پڑی تھی۔ درحقیقت اسپین میونخ اور ماسکو کے واقعات کے بعد وہ عملاً جنگ ہار چکا تھا۔ فرانس جیسے شکست خوردہ ملک اور پولینڈ جیسی کمزور طاقت کو ساتھ لے کر تن تنہا ہٹلر کے مقابلہ پر آجانے کے معنے یہ تھے کہ برطانیہ اپنے آپ کو دیدہ و دانستہ تباہی کی طرف لے جا رہا تھا۔ لیکن جنگ

کرنے کی صورت میں بھی اس تباہی سے بچاؤ کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیونکہ اب چیمبرلین کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہٹلر کے حقیقی ارادے کیا ہیں۔ دو روز کی ٹال مٹول کے بعد جس میں فرانسیسی وزیر اعظم بانٹ نے پولینڈ سے غداری کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ لارڈ ہیلی فیکس نے جرمن سفیر کو ایک نوٹ حوالہ کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ چونکہ برطانوی الٹی میٹم کا جرمنی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لئے گیارہ بجے دن سے برطانیہ اور جرمنی کے مابین حالت جنگ قائم ہو چکی ہے۔

(ج) امریکہ

امریکہ کے متعلق فریڈرک شومین (FREDERICK SCHUMAN) لکھتا ہے:۔

امریکہ کو یورپین اقوام نے آباد کیا تھا۔ اور یہ ملک کولمبس کے زمانہ سے یورپ کے سیاسی نظام کا ایک جزو تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں صرف اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ ۱۷۷۶ء میں امریکن باغیوں کو فرانس نے پوری مستعدی اور قوت سے انگریزوں کے خلاف مدد بہم پہنچائی۔ امریکہ کی لاطینی (LATIN) ریاستوں کو بھی ایک یورپین جنگ کے نتیجہ میں آزادی ملی۔ ان جنوبی امریکی ریاستوں کے بقاء و تحفظ میں محض ۱۸۲۳ء کے اصول مانرو (MONROE DOCTRINE) کا دخل نہیں تھا جس کی رو سے امریکی معاملات میں یورپین اقوام کی مداخلت کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ برطانیہ اپنی تجارتی اغراض کے لئے اُن کی خود مختاری کی حفاظت کرنا اور براعظم یورپ کی طاقتوں کو اُن پر دوبارہ قبضہ جمانے سے روکنا چاہتا تھا

پہلی جنگ عظیم کی ابتداء میں امریکہ کی رائے عامہ یورپین اقوام کی باہمی جنگ و جدال سے بالکل الگ رہنے کے موافق تھی۔ لیکن ۱۹۱۷ء تک امریکی حکومت کی روش میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ روز بروز اتحادیوں کی طرف مائل ہوتی گئی۔ لیکن اس تبدیلی کے تحت میں انسانیت دوستی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ جیسا کہ امریکی لیڈر اپنی تقریروں میں ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ تجارتی اور سیاسی اغراض امریکہ کو اس طرف لے جا رہے تھے۔ امریکی سرمایہ داروں نے متحدین کو بڑی بڑی رقمیں قرض دی تھیں اور امریکی سوداگروں نے جن کے ہاتھ میں ملک کی بیرونی تجارت تھی۔ متحدین کے ممالک کو بڑے بڑے منافع پر کثیر مقدار میں سامان تجارت فروخت کیا تھا جس کی قیمت انھیں وصول طلب تھی۔ ان حالات میں متحدین کے شکست کھا جانے کے معنی یہ ہوتے کہ دیوالیہ ہو جانے کے باعث انھیں

مجبوراً امریکی سرمایہ اور قرضہ کی ادائیگی سے دستکش ہو جانا پڑتا اور اس طرح امریکی سرمایہ داروں اور تاجروں کی وصول طلب رقوم بالکل ضائع ہو جاتیں جرمنی و اس کے حلیفوں کی فتح سے نہ صرف امریکہ کے معاشی مفاد کو سخت دھکا پہنچتا۔ بلکہ یورپ کا توازن قوت درہم برہم ہو جاتا اور جرمنی کی غیر معمولی طاقت سے بالآخر خود امریکہ کے تحفظ کو خطرہ پیدا ہو جاتا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد امریکہ نے پھر ایک مرتبہ یورپی معاملات سے علیحدگی کی روش اختیار کی۔ چند سمجھدار لوگوں کے سوا جو یہ چاہتے تھے کہ امریکہ ایسے طرز کی غیر جانبداری نہ اختیار کرے جو جارحانہ اقدام کرنے والی جنگ پسند سلطنتوں اور امن پسند ممالک دونوں کے ساتھ یکساں سلوک پر مبنی ہونے کی وجہ سے بالواسطہ جنگ پسندوں کی امداد کا موجب ہو امریکی عوام اور لیڈروں کی عظیم اکثریت یورپ کے جھگڑوں سے علیحدہ رہنا ہی پسند کرتی تھی اور اس مقصد کے پیش نظر ظالم و مظلوم طاقتوں اور دیگر جنگ پسندوں اور امن پسندوں کے مابین کوئی امتیاز قائم کرنے پر تیار نہ تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں امریکن غیر جانبداری کو موثر بنانے کے لئے کئی قوانین نافذ کئے گئے لیکن ان قوانین کے نفاذ سے پہلے امریکی سنانٹ کی ایک قرارداد کے بموجب سنات ارکان سنات کی ایک کمیٹی نے جس کا صدر جیرالڈ پی۔ نائی (GERALD P. NYE.) تھا۔ اسلحہ سازی کے کاروبار کی تحقیقات شروع کی۔ ان تحقیقات کنندوں نے بر بنائے واقعات و شواہد ثابت کیا کہ اسلحہ بنانے والی خانگی کمپنیوں نے متعدد بار حکومت کے ایسے تمام قوانین کی بالاتر خلاف ورزی کی تھی یا اُن سے گریز کی راہیں تلاش کر لی تھیں جو اسلحہ سازی پر قابو حاصل کرنے یا نگرانی قائم رکھنے کی غرض سے نافذ کئے گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کاروبار سے فائدہ اٹھانے والے اشخاص نے سرکاری عہدہ داروں کو رشوت دے کر بیرونی ممالک سے اسلحہ سازی کے ٹھیکے حاصل کرنے میں بھی سرکاری عہدہ داروں نے ان کو بڑی مدد ملی۔ اس امر کی بھی شہادت دستیاب ہوئی کہ اسلحہ سازی کے کارخانہ داروں نے ہتھیاروں کی برآمد اور فروخت کی ممانعت کے قوانین کی مخالفت کرنے کیلئے، اخباروں

کے ذریعہ منظم پروپاگنڈے کا بازار گرم کر رکھا تھا اور امریکہ کے فوجی مصارف میں اضافہ کی تجاویز کو کامیاب اور وسیع کرنے کے لئے متعلقہ اشخاص کو بے حد و بے حساب روپیہ کھلایا تھا۔ مزید برآں امریکی اسلحہ سازوں نے بیرونی ممالک کے ہم پیشہ افراد سے کئی راضی نامے کر رکھے تھے۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلحہ کی فراہمی اور بہم رسانی کے لئے دنیا کے مختلف علاقوں کو آپس میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح امریکی تحقیقاتی کمیٹی نے بربنائے واقعات و شواہد یہ ثابت کر دیا کہ موت کے ان سوداگروں نے سارے عالم میں اپنی خفیہ کارروائیوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔"

آگے چل کر شومین لکھتا ہے :-

"امریکہ اس ذہنی اور روحانی خانہ جنگی سے محفوظ نہ تھا جس سے مغربی ممالک کی روح زخمی ہو چکی تھی اور جس کے نتیجہ میں فرانس اور برطانیہ بزمانہ کساد بازاری میں انتشار و زوال کے آثار پورے طور پر طاری ہو چکے تھے۔ بڑی بڑی جائدادیں اور سرمایہ رکھنے والوں کے دل میں کمیونزم کا اتنا ہی خوف تھا جتنا یورپ میں۔ لیکن امریکی مداخلت پسندوں (INTERVENTIONISTS) اور علیحدگی پسندوں (ISOLATIONISTS) کے درمیان اختلافات زیادہ شدید تھے۔ انگریز اور فرانسیسی علیحدگی پسند جو بین الاقوامی جھگڑوں سے علیحدہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ رجعت پسند عناصر پر مشتمل تھے جن کا بے اندازہ سرمایہ ان کے قومی بینکوں میں جمع تھا۔ اس کے برخلاف انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مداخلت پسند پارٹیاں جو دنیا کو اجتماعی تحفظ (COLLECTIVE SECURITY) اور امن و انصاف کے اصولوں پر چلانا چاہتی تھیں۔ جمہوریت پسند عناصر پر مشتمل اور مزدوروں کسانوں وغیرہ کے احساسات کی ترجمان تھیں۔ امریکہ میں صورت حال کے بالکل برعکس تھی۔ یہاں بڑے بڑے سرمایہ دار مداخلت پسند تھے اور

متوسط طبقات۔ مزدوروں اور کسانوں کے ترجمان بین الاقوامی جھگڑوں
سے علیحدہ رہنا چاہتے تھے۔ کانگرس۔ امریکی صحافت اور امریکی عوام کا ایک
مفروضہ یہ تھا کہ امریکہ کو سابقہ جنگوں میں گھسیٹنے کی ذمہ داری اسلحہ
سازی کے تاجروں اور صنعت کاروں۔ مالکان بینک اور تاجران
برآمد (EXPERT TRADERS.) پر تھی۔ جنہوں نے
انسانی قتل و خونریزی کو اپنے ذاتی منافع کا وسیلہ بنا لیا تھا یہ مفروضہ
بڑی حد تک صحیح تھا لیکن پورے طور پر نہیں۔ بہر حال اسی مفروضہ کی
بنا پر ۳۱ اگست ۱۹۳۵ء کو جبکہ اطالیہ اور حبشہ کے تعلقات کی خرابی
کے باعث یورپین جنگ کا خطرہ سر پر آگیا۔ امریکی کانگرس نے ایک
قانون غیر جانبداری منظور کیا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ اگر کوئی دو ممالک
آپس میں برسر جنگ ہو جائیں تو صدر امریکہ اس امر کا اعلان کرے گا اور
ایسے اعلان کے بعد سے ان دونوں ممالک کو اسلحہ اور آلات جنگ یا
جنگی مشینوں کے پرزوں کی فراہمی اور برآمد ممنوع قرار پائے گی۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد محارب ملکوں سے صرف اسلحہ کی
تجارت موقوف ہو گئی۔ لیکن دوسری اشیا تجارت کی برآمد کا سلسلہ
برابر جاری رہا۔ اس کے علاوہ اسلحہ کی برآمد کے بارے میں جو ممانعت
کی گئی۔ اس میں اس امر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا کہ محارب ملک حملہ آور
ہے یا جائز طور سے اپنے ملک کی مدافعت کر رہا ہے۔ یعنی ظالم و مظلوم،
حملہ آور اور مدافع کو ایک ہی صف میں رکھا گیا تھا جس کے معنے یہ تھے
کہ اگر کوئی حکومت ظالمانہ طور پر کسی دوسری کمزور قوم پر حملہ کر دے تو
غیر جانبداری کے قانون کی رو سے صرف حملہ آور ہی کو ہتھیاروں کی فراہمی
سے نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ وہ کمزور قوم بھی جس کو اپنے ملک کی مدافعت
کے لئے اسلحہ درکار ہوں، امریکی اسلحہ خریدنے کی حقدار نہ ہوگی۔

حبشہ پر اطالیہ کے حملہ کے دو روز بعد ۵ اکتوبر ۱۹۳۵ئہ کو صدر روز ویلٹ نے اعلان کیا کہ حبش اور اطالیہ دونوں محاربین کو ہتھیار، آلاتِ حرب اور سامانِ جنگ کی برآمد ناجائز اور خلافِ قانون قرار دے دی گئی ہے۔ اعلان میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ اطالیہ نے مجلس اقوام کے تصفیہ کے بالکل برخلاف اور اس کی رضامندی حاصل کئے بغیر ایک بے گناہ قوم پر حملہ کر کے جارحانہ جنگ کا آغاز کیا ہے۔ اس طرح اسلحہ اور آلاتِ حرب کی برآمد کو ممنوع قرار دینے سے اطالیہ کو حملہ آور ہونے کے باوجود بمقابلہ حبشہ زیادہ فائدہ پہنچا۔ اور حبشہ کو خواہ مخواہ اپنی بے گناہی کی سزا بھگتنی پڑی۔ کیونکہ حبشہ کے لئے اب اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ امریکہ سے اسلحہ خرید کر اپنے ملک کی مدافعت کر سکے۔ اس کے برعکس اطالیہ ہتھیار اور سامانِ جنگ کے ماسوا دوسری تمام اشیا امریکہ سے حاصل کر سکتا تھا۔ چنانچہ صدر روز ویلٹ کے اعلان کے بعد ہی اطالیہ اور امریکہ کے تجارتی لین دین کی رفتار میں کئی گونہ اضافہ ہو گیا۔ اطالوی افریقہ کو سامان تجارت کی جو مقدار امریکہ برآمد کرتا تھا۔ اس کی قیمت ۱۹۳۴ئہ میں اوسطاً (۳۰۴۲۵) ڈالر ماہانہ تھی لیکن اسی سامان کی قیمت اکتوبر ۱۹۳۵ئہ میں (۸۹۷۳۶۷) ڈالر اور نومبر ۱۹۳۵ئہ میں (۵۸۳۷۳۵) ڈالر ہو گئی۔ اطالیہ کو خام تیل جس مقدار میں برآمد ہوتا تھا اس میں (۶۰۰) فیصد کا اضافہ ہو گیا۔ اطالوی افریقہ کو اس زمانہ میں جو خام تیل برآمد کیا گیا وہ گذشتہ سالوں کی برآمدات کے مقابلہ میں دس لاکھ فیصد زیادہ تھا۔ حبشہ کی امریکی برآمدات میں بڑی بھاری تخفیف ہو گئی۔ امریکی قوم کے اخلاقی مواعظ و نصائح کا اطالیہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تیل کی وافر مقدار پہنچ جانے سے مسولینی کو بالآخر حبشہ پر مکمل فتح نصیب ہوئی اور اس تیل کا زیادہ حصہ امریکہ سے ہی برآمد کیا گیا تھا۔ امریکہ کے کاروباری حلقوں نے حسبِ معمول اس جنگ سے خوب روپیہ کمایا۔ اور ان کی تمام کارروائیوں اور سرگرمیوں سے حملہ آور اطالیہ کو مدد اور تقویت پہنچی۔

مشرق بعید میں بھی امریکی قانون غیر جانبداری کا فائدہ جاپانیوں کو حاصل ہوا۔ جس نے چین پر حملہ کر کے اس کے وسیع اور زرخیز علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۲۶ جولائی

کو امریکہ نے جاپانی حکومت کو اطلاع دی کہ سنہ ۱۹۱۱ء کا معاہدہ کالعدم ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود چین کے حملہ آوروں یعنی جاپان کو امریکہ سے بڑی بھاری مقدار میں سامان ملتا رہا۔ چنانچہ جاپان نے تیل کے (۶۵) فیصد ذخائر (۶۵) فیصد موٹر کاریں (۷۷) فیصد ہوائی جہاز اور (۹۰) فیصد لوہا اور تانبا امریکہ کی منڈیوں سے خریدا۔ اس عمل اور طریق کار جیسے حملہ آور طاقتوں اور جارحانہ حکومتوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جنگجوئی اور بین الاقوامی لوٹ مار کی کارروائیوں میں امریکہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھائے گا جس سے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔

درحقیقت امریکی خارجی پالیسی کو دانشمندی اور وسیع النظری سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ اگر سنہ ۳۷ء میں امریکہ فاسسطی حکومتوں کے مقابلہ میں ان کمزور ممالک کی پوری پوری مدد کرتا، جن پر یکے بعد دیگرے یہ حکومتیں قابض ہوتی جا رہی تھیں تو روم، برلن اور ٹوکیو کے جنگ آزما حکمرانوں کو دول عظمیٰ سے لڑائی مول لینے کی جرأت نہ ہوتی۔ کیونکہ ابھی تک فاسسطی حکومتوں کی طاقت اتنی زبردست نہیں ہوئی تھی۔ اس طرز عمل کا لازمی اثر اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ہٹلر مسولینی اور ٹوجو کے قدم رک جاتے اور ان کے جارحانہ منصوبوں کی ناکامی کے باعث عوام میں انہیں وہ مقبولیت کسی طرح نہ حاصل ہو سکتی جس کے بل پر انہوں نے اپنے عزائم کا نقشہ مرتب کیا تھا بلکہ ممکن تھا کہ داخلی انقلابات ان حکومتوں کو نیست و نابود کر دیتے کیونکہ ان کے استحکام کا سارا دار و مدار اس بات پر تھا کہ جو توقعات عوام نے ان سے وابستہ کی تھیں وہ پوری ہو سکیں گی یا نہیں لیکن پہلے تو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی غلط پالیسی نے ان کی کامیابیوں کی راہ کھول دی، دوم خود امریکہ کے لوگ اپنی حفاظت اسی میں خیال کرتے تھے کہ عالمی امن کے قیام کے لئے انہیں کوئی خطرہ نہ مول لینا پڑے۔ چنانچہ ایسے تمام عناصر پر جو فاسسطی حکومتوں کے مقابلہ میں جرأت مندانہ اقدام کے حامی تھے۔ امریکہ میں کمیونسٹ ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ سنہ ۲۹ء تک امریکہ کا موقف اتنا مضبوط تھا کہ اگر وہ چاہتا تو یورپ میں لڑائی کو روک دیتا۔ مثلاً اگر امریکی حکومت یہ اعلان کر دیتی کہ جس ملک پر ہٹلر یا مسولینی حملہ آور ہوں گے۔ امریکہ اس کی پوری پوری امداد کرے گا تو ان دونوں آمروں

کو جنگ شروع کرنے کی جرأت ہرگز نہ ہوتی اور اب تو لندن اور پیرس کی حکومتیں بھی اس قسم کے اقدام پر تیار تھیں لیکن کمیونزم کے مہمل خوف اور فاسسٹ طبیوں کے ساتھ خفیہ ہمدردی کے جذبے نے امریکہ کو اس جرأت مندانہ اقدام سے باز رکھا۔

بالآخر جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا اور جاپانیوں کے مقابلہ پر امریکہ کو شریک جنگ ہونا پڑا تو اہل امریکہ کے لئے کہ اس جنگ کا تجربہ بہت زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے دل شکوک وشبہات اور احساس گناہ سے لبریز تھے۔ اولاً فرانس۔ انگلستان اور دوسرے حلیفان جنگ کے برعکس امریکہ کی سرزمین پر نہ تو دشمن کا کوئی فوجی حملہ ہوا اور نہ فضائی بمباری سے اس کو کوئی نقصان پہنچا۔ جو امریکن سپاہی جنگ میں ہلاک یا زخمی ہوئے۔ ان کی تعداد یورپ اور ایشیا کے برسر جنگ ممالک کے ہلاک شدگان اور مجروحین کی تعداد کے مقابلہ میں صفر تھی۔ حالانکہ یہ سب لوگ ایک مشترکہ مقصد کے لئے لڑ رہے تھے دوئم اس جنگ کی بدولت امریکہ کو بے شمار معاشی فوائد حاصل ہوئے اور اس کی دولت و ثروت میں بے اندازہ اضافہ ہوگیا۔ پٹہ اور قرضہ کی اسکیم کے تحت امریکی حکومت نے دوسرے ممالک کو جو لامحدود سرمایہ قرض دیا اور جنگی ضروریات پر اسے جو خطیر رقمیں صرف کرنی پڑیں۔ وہ درحقیقت کاغذی قربانیاں تھیں۔ کیونکہ محصولات میں اضافہ اور اشیاء خوردنی کی کمی کے باوجود وہ ہر ڈالر جو امریکہ کو خرچ کرنا پڑا کسی نہ کسی شکل میں امریکی سپاہیوں۔ افسروں۔ نظم ونسق کے عہدہ داروں۔ کارخانوں کے مالکوں۔ بینک کے ساہوکاروں' مزدوروں اور کسانوں کی جیبوں میں پھر واپس ہو جاتا تھا۔ امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کے مصارف میں بے انتہا اضافہ عمل میں آیا۔ قومی آمدنی تقریباً دوگنی ہوگئی۔ بے کاری کا نام ونشان نہ رہا۔ اور امریکی قوت پیداوار میں اتنی دونی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ ان حالات میں اگر امریکہ کا اجتماعی ضمیر اس جنگ کے دوران میں غیر مطمئن رہا تو اس میں کوئی امر باعث تعجب نہ تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں جبکہ ٹرومین کو امریکہ کی صدارت ملی اس وقت حکومت اور نظم ونسق کی نااہلی ہیئت کیا تھی۔ اس کا حال شوبین نے

ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

" امریکی سلطنت کا موثر اقتدار بینک کے مالکوں اور فوجی افسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا تھا۔ مثلاً محکمۂ دفاع کا سیکریٹری جیمس فارسٹل (JAMES-V. FORRESTAL) ڈلن ریڈ اینڈ کمپنی (DILLON READ & CO.) کا سابقہ صدر تھا۔ . . . .

. . . جس میں محکمہ فوج کا انڈر سیکریٹری نائب صدر تھا محکمہ تجارت کا سیکریٹری مسٹر ایوہرل ہیرمین (AVERELL HARRIMAN) نہ صرف خاندانی کروڑپتی تھا۔ بلکہ براؤن برادرس ہیرمین اینڈ کمپنی کا بانی بھی تھا۔ اسی کمپنی کا ایک شریک رابرٹ لاوٹ (ROBERT LOVETT.) تھا جو امریکہ کے انڈر سیکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدہ پر کام کر رہا تھا۔ اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ چارلس سالٹزمین (CHARLES SALTZMAN) نیویارک کے اسٹاک ایکسچینج کا نائب صدر تھا۔ امریکی محکمہ خزانہ کا سیکریٹری (SECRETARY OF THE TREASURY) جان سنڈر JOHN SYNDER) سینٹ لوئی کا ایک ساہوکار (BANKER) تھا۔ پوپ کے دربار میں امریکی صدر کا شخصی سفیر مائرن ٹیلر امریکہ کی صنعت فولاد کے بورڈ کا نائب تھا۔ ۱۹۴۷ء تک حسب ذیل عہدے جن پر عموماً سول سروس کے اشخاص مامور کئے جاتے تھے پیشہ ور فوجیوں کے ہاتھوں میں تھے۔

۱۔ صدر امریکہ کا چیف آف دی اسٹاف ' ولیم ڈی لیہی (WILLIAM, D. LEAHY.)

۲۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ ۔ جارج سی مارشل (GEORGE. C. MARSHALL)

۳۔ اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ ' چارلس سالٹزمین (CHARLES SALTZMAN)

۴۔ سیکریٹری محکمہ فوج کینتھ سی رائل (KENNETH C. ROYAL.)

۵۔ انڈر سیکریٹری محکمہ فوج ولیم ' ایچ ڈریپر (WILLIAM. H. DRAPT.)

۶۔ جرمنی کا گورنر کلے (CLAY)

۷۔ جاپان کا گورنر میک آرتھر (MAC ARTHUR)

۸۔ آسٹریا کا گورنر جیوفری کیز (GEOFFREY KEYES)

امریکی سفیر خاص متعینہ چین ویڈمیئر (WEDMEYER).
" " روس والٹر بیڈل اسمتھ (WALTER BEDELL SMITH)
" " پانامہ فرینک ٹی ہائنس (FRANK T. HINS.)
" " جنوبی افریقہ تھامس ہال کومب (THOMAS HALCOMB.)
" " بلجیئم الن گرک (ALLEN. G. KIRK.)

ٹرومین کے دورِ حکومت میں اختتامِ جنگ کے دو سال کے اندر امریکہ دس ارب ڈالر سالانہ اسلحہ سازی پر صرف کر رہا تھا۔ اس کے تجارتی اور کاروباری افراد اتنے کثیر منافع پیدا کر رہے تھے۔ جتنے اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں کیے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب امریکہ کی حکومت بڑے بڑے فوجیوں اور تاجروں کے قبضہ میں تھی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان امریکہ میں کمیونزم کے خلاف جو ہیجان برپا ہوا اس کی شدت کا مقابلہ اگر کمیونسٹوں کے اثر اور طاقت سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے مابین کوئی نسبت نہ تھی اگر بفرضِ محال یہ بھی مان لیا جائے کہ کمیونسٹوں کی نیت واقعی خراب تھی۔ جنگی ساز و سامان کے اعتبار سے ہر شاخ میں روس امریکہ سے بدرجہا کمزور اور کمتر تھا۔ امریکن کمیونسٹ پارٹی کو کبھی کسی ملکی انتخاب میں $\frac{1}{2}$ فیصد سے زیادہ ووٹ نہیں ملے اور یہ ووٹ بھی صرف ایک بار یعنی ۱۹۴۵ء میں ملے تھے۔ اس کے باوجود ایک بھاری بھرکم اور خونخوار روسی ریچھ کی حیثیت سے جو ان کے خیال میں ساری دنیا کے امن و آزادی کا ستیاناس کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اہلِ امریکہ لرزہ براندام نظر آتے تھے۔ یہ تصور کہ غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹ امریکہ کے غیر مطمئن اور باغی عناصر کے ساتھ مل کر امریکی جمہوریت کا تختہ الٹ دینے کی فکر میں ہیں - امریکی حکمرانوں کا خواب و خور حرام کئے ہوئے تھا۔ امریکہ پر یہ خوف کیوں طاری تھا اور وہ کس امر سے خائف تھا۔ اس کا جواب روسیوں کے طرزِ عمل کی روشنی میں نہیں دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خوف کا اولین مصدر افراد و اقوام کی اپنی شخصی اور اجتماعی بداعمالیوں اور ان سے پیدا ہونے والے احساسِ گناہ میں پنہاں ہوتا ہے۔ ایک ایسی

سرزمین جس کی دولت لامحدود جس کی طاقت کے آگے چنگیز خانی جلال و جبروت مات تھا۔ جس کی قومی آمدنی کی کوئی حد و انتہا نہ تھی اور جس کا مستقبل اتنا شاندار نظر آتا تھا اگر اس کے باشندوں پہ اس قسم کا خوف طاری ہوجائے تو اس کا سبب خارجی حالات میں نہیں بلکہ داخلی نظام کی خرابیوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ امریکی جمہوریت فی الحقیقت آزادی کی وہ جنت نہ تھی۔ جس کا نقشہ امریکی مصنفوں کی کتابوں میں کھینچا گیا ہے۔ امریکی نظام معیشت میں اعلیٰ اور متوسط طبقوں کو رزق کی فراوانی ضرور حاصل تھی۔ لیکن ان کے ذہن روحانی سکون و اطمینان سے محروم تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ بے اندازہ دولت انہیں پاک اور جائز ذرائع سے نہیں مل رہی ہے۔

امریکہ کی متکبرانہ خارجی پالیسی

روزویلٹ نے روس کے تعلق سے جو بیرونی پالیسی اختیار کی تھی۔ اگست ۱۹۴۵ء سے اس کا رخ پلٹنا شروع ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ نے اعلان کیا کہ امریکہ کو بلغاریہ کی موجودہ حکومت کے نمائندہ ہونے میں شک ہے کیونکہ اس میں ملک کے جمہوری عناصر کو شریک نہیں کیا گیا ہے۔ دو روز کے بعد برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بیون نے بھی اسی قسم کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ بلغاریہ رومانیہ اور ہنگری میں جو طرز حکومت قائم ہے۔ اس کی موجودگی میں انگلستان کے لئے ان ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ بلقان کے ممالک میں جمہوریت کے فقدان کا یہ ماتم کہاں تک حقیقی خلوص پہ مبنی تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اسپین۔ پرتگال۔ ترکی۔ ایران اور ارجنٹائن وغیرہ میں بھی جمہوری حکومتیں ناپید تھیں۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ کو ان حکومتوں پہ کوئی اعتراض نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بلقان کے ممالک پہ امریکہ اور انگلستان کا یہ سب و شتم ایک نئی پالیسی کا آغاز تھا۔ جو یالٹا (YALTA) کے معاہدہ کے بالکل منافی

تھی۔ کیونکہ اس معاہدہ کی رُو سے چرچل اور روزویلٹ دونوں نے دریائے ڈینیوب کے آس پاس کے ممالک پر روس کی سیادت تسلیم کر لی تھی۔ اس لئے ان ممالک کے اندرونی نظم حکومت کا سوال اٹھانے کے یہ معنی تھے کہ برطانیہ اور امریکہ معاہدہ یالٹا کے خلاف بلقان سے روسی اثر مٹانا چاہتے تھے۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو صدر ٹرومین نے کانگریس سے چالیس کروڑ ڈالر کی رقم کے لئے استدعا کی، یہ رقم یونان اور ترکی کی امداد کے لئے مانگی گئی تھی اور وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ یونان اور ترکی روسی حملہ یا کمیونسٹ انقلاب کی زد میں ہیں یہ بھی کہا گیا کہ یہ دونوں ممالک جمہوری ہیں اور اس لئے اس عالمگیر کشمکش کی ضمن میں جو جمہوریت اور آمرانہ طرزِ زندگی کے مابین جاری ہے۔ یہ دونوں امریکی امداد کے مستحق ہیں کیونکہ امریکہ پر آمریت اور مطلق العنانی کے مقابلہ میں جمہوریت کی حمایت فرض ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے اس وقت تک ترکی پر ایک واحد سیاسی جماعت کی ڈکٹیٹرشپ قائم تھی۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں جو انتخابات منعقد کئے گئے اور جس میں پہلی مرتبہ حزبِ مخالف (OPPOSITION PARTIES) کو شریک ہونے کی اجازت ملی۔ ان کا انعقاد مارشل لاء کے تحت عمل میں لایا گیا۔ اور تمام مخالف حکومت اخبار بند کر دیئے گئے۔ اکثر بیرونی مشاہدین (FOREIGN OBSERVERS.) کا بیان ہے کہ ان انتخابات میں ترکی حکومت کی کامیابی طاقت اور دباؤ کے استعمال کا نتیجہ تھی۔ یونانی حکومت کے بارے میں جو انگریزوں کی ساختہ پرداختہ تھی مخالفین کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ملوکیت پسند اور فاسسطی عناصر کی گٹھ جوڑ سے قائم کی گئی ہے، اور انتخابات میں اس کی کامیابی زیادہ تر کمیونزم کے خوف سے عمل میں آئی ہے۔ نہ کہ بادشاہت یا فاسسطی طرزِ حکومت کی مقبولیت کے باعث۔ ٹرومین کے اس اقدام سے پہلے ستر کروڑ ڈالر کی ایک بیش قیمت رقم یونان پر صرف کی جا چکی تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس خرچ سے عوام کی پریشانیاں دور ہوتیں یا مصیبت زدگان جنگ کی امداد عمل میں آتی۔ اس کا واحد اثر یہ ہوا کہ چور بازاری بڑھ گئی۔

اسباب تکلفات اور اشیائے تعیش کی درآمد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور چند منافع بازوں اور بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں نے خوب دل کھول کر اپنی جیبیں بھر لیں۔ یونان کی اندرونی حالت یہ تھی کہ اس کی حکومت قیمتوں پر نگرانی اور سکہ کی اصلاح کی تمام تجاویز کو مسترد کر چکی تھی۔ اس کے بجائے وہ پولیس اور فوج میں مزید اضافہ کے لئے رقمی امداد کی طلبگار تھی۔ اس کی ایک لاکھ تیس ہزار فوج تیرہ ہزار باغیوں کی سرکوبی سے عاجز تھی۔ چند ہی روز کے اندر باغیوں کی تعداد پچیس ہزار تک بڑھ گئی۔ رجعت پسند عناصر کی ظالمانہ کارروائیوں نے ہزاروں یونانیوں کو باغیوں کی حمایت پر آمادہ کر دیا اور امریکہ کے عہدہ داروں اور مشیران کار نے جو یونانی حکومت کی رہبری کر رہے تھے ان مظالم سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کر لی۔"

اخلاقی جرائم کی شدت و وسعت

ابھی حال میں یعنی ۱۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو امریکہ کے ایک سابق صدر مسٹر ہربرٹ ہوور (HERBERT HOOVER) نے ایک تقریر کے دوران میں جو تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہو چکی ہے امریکہ کی اخلاقی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا

> "امریکہ کی پبلک لائف میں عقلی بددیانتی نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہی خرابیاں قوموں کو پہلے بھی شکست و بربادی میں مبتلا کر چکی ہیں۔ دنیا کی نجات کے لئے امریکہ کی کوششیں اسی وقت بار آور ہو سکتی ہیں۔ جبکہ پہلے امریکہ اپنے گھر کی برائیوں پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ میں جانتا ہوں کہ امریکی کانگریس ایک نئے اخلاقی ضابطہ کی تلاش میں ہے جو سرکاری عہدہ داروں کے مظالم اور دست درازیوں سے امریکی عوام کی حفاظت کر سکے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اہل امریکہ کی اصلاح کے لئے ایک اخلاقی ضابطہ سے زائد کسی اور چیز کی ضرورت ہو گی۔"

یہ تقریر ہربرٹ ہوور نے اپنی ۷۷ ویں سالگرہ کے موقعہ پر کی تھی۔ اور اسے سارے ملک کی نشرگاہوں سے نشر کیا گیا تھا۔ اسی تقریر کے دوران میں آگے چل کر ہوور نے کہا :-

کانگریس ملکی قوانین کی توسیع اس طرح کر سکتی ہے جس سے نئی قسم کی رشوتوں کا سدباب کر دیا جائے۔ لیکن کانگریس ذہنی غداری اور عقلی بددیانتی کا مقابلہ کیسے کرے گی۔ گذشتہ چند سال کے اندر کانگریس کی کئی کمیٹیوں اور کئی امریکی ریاستوں کی مجالس قانون ساز نے بڑے بڑے اہم عہدہ داروں کے کرتوتوں پر سے پردہ اٹھایا ہے جن لوگوں نے امریکی مملکت کی بنیاد رکھی تھی وہ ان احتبا ذاذیوں اور بے ایمانیوں پر کیسے شرمسار ہوتے جو سرکاری ٹھیکوں اور قرضوں کی تقسیم کے سلسلہ میں عمل میں آ رہی ہیں یا ہماری اس ناکامی کا کتنا ماتم کرتے کہ ہم جواریوں اور چور بازاری کرنے والوں کو قانون کی گرفت میں لانے سے معذور ہیں، کیونکہ ان مجرموں نے سرکاری عہدہ داروں کو رشوت کھلا کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ نیز وہ ان خفیہ معاہدوں کے متعلق کیا کہتے جن کے وجود سے پہلے تو مسلسل انکار کیا جاتا رہا۔ لیکن جن کا اب علانیہ اعتراف کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ہم نے طہران اور یالٹا میں پچاس کروڑ انسانوں کی آزادی کو روس کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔"

یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو واشنگٹن سے ایک اور خبر شائع ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکی سنات کی مجلس تحقیقات جرائم نے اپنی حالیہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ امریکہ میں چھوٹے بڑے مجرمین بڑے پیمانہ پر سرکاری عہدہ داروں کو رشوت کھلا کر قانون کی گرفت سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس رپورٹ میں ایک ایسی غیر سرکاری مجلس کے قیام کی سفارش کی گئی ہے جس کا کام یہ ہو کہ وہ جرائم اور رشوت ستانیوں کے واقعات کو

منظرِ عام پر لا کر ان کا مناسب تدارک کرے۔

امریکی نظم ونسق میں رشوت ستانیوں اور دوست نوازیوں کا حال بیان کرتے ہوئے والٹر لینگ سیم (WALTER LANGSAM) اپنی کتاب (WORLD SINCE 1914) کے صفحہ ۶۸۷، ۶۸۸ پر لکھتا ہے :-

"جون ۱۹۲۳ء کو امریکی صدر ہارڈنگ الاسکا کے دورہ پر روانہ ہوا۔ روانگی سے قبل اس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ الاسکا پہنچکر وہ بیمار پڑا اور ۲ / اگست کو جبکہ وہ امریکہ واپس ہو رہا تھا۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ ہارڈنگ کی موت کا اصلی سبب تو معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن یہ باور کرنے کی وجہ ہے کہ اس کا ذہن عرصہ سے پریشان تھا اور سرکاری عہدہ داروں کی بدعنوانیوں اور بددیانتی کے پیہم واقعات نے جن کا اسی زمانہ میں انکشاف ہوا تھا۔ اس کی ذہنی کوفت میں اور زیادہ اضافہ کر دیا۔

اس قسم کا ایک واقعہ چارلس فوربس (CHARLES FORBES.) سے متعلق تھا جو (VETERAN'S BUREAU.) کا ڈائرکٹر تھا۔ سنات کی ایک تحقیقاتی مجلس کے بیان کے مطابق فاربس اپنے سرکاری فرائض کے سلسلہ میں نہایت درجہ اسراف غفلت اور دیگر بداعمالیوں کا مرتکب ہوا تھا۔ جن کی وجہ سے امریکی حکومت کو مجموعی طور پر بیس کروڑ ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دوسری تحقیقاتی مجلس نے اٹارنی جنرل (ATTORNEY GENERAL.) ڈایرٹی (DAUGHERTY) کے متعلق یہ انکشاف کیا کہ اس نے محکمہ عدالت میں نہایت بدنام اور بداطوار اشخاص بھر لئے تھے۔ مزید برآں اس نے کئی مجرموں کے مقدمات پر دیدہ و دانستہ کارروائی کرنے سے گریز کیا۔ جب ڈایرٹی نے مجلس تحقیقات کو اپنے دفتری کاغذات کے معائنہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو صدر کولج نے اسے مارچ ۱۹۲۴ء میں ملازمت سے برطرف کر دیا۔

لیکن سب سے زیادہ عہد کا فضیحتی ایک اور واقعہ کے سلسلہ میں ہوئی جو امریکی حکومت کے تیل کے محفوظ ذخائر سے متعلق تھا۔ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ امریکی صدر ہارڈنگ نے بحریہ کے سکرٹری ایڈون ڈینبی (DENBY) کو ایک سرکاری حکم کے ذریعہ اجازت دی تھی کہ (ELK HILLS.) اور (TEA POT DOME) میں امریکی حکومت کے تیل کے جو محفوظ ذخیرے موجود تھے۔ ان کا انتظام وہ وزارت داخلہ کے سکرٹری البرٹ بی فال (ALBERT. B. FALL) کو منتقل کر دے۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں فال نے بغیر کسی سرکاری اعلان و اشتہار کے سن کلیر (SINCLAIRF) کو (TEA POT DOME) کے ذخائر اور ایڈورڈ ڈوھنی (EDWARD DOHNEY) کو (ELK HILLS.) کے ذخائر پٹہ پر دے دیئے۔ جب اس معاملت کا راز افشا ہوا تو امریکن رکن سنیٹ تھامس والش (THOMAS WALSH) کی صدارت میں ایک مجلس تحقیقات منعقد ہوئی۔ اس مجلس کی تحقیقات کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ امریکہ میں سرکاری عہدہ داروں کی بدعنوانیوں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا ہے۔ سن کلیر کے متعلق تحقیقات کرنے سے یہ پتہ چلا کہ اس نے انتخابات کے موقعہ پر جمہوری پارٹی (REPUBLICAN PARTY) کو اس کی انتخابی سرگرمیوں کے لئے ایک بیش قرار رقم دی تھی۔ یہ بھی دریافت ہوا کہ ڈوھنی نے ۱۹۲۱ء میں فال کو بغیر کسی ضمانت کے ایک لاکھ روپیہ بے سود کا قرضہ دیا تھا۔ اسی طرح فال نے سن کلیر سے پچیس ہزار ڈالر کی رقم قرض لی تھی۔ اور تیل کے کئی تاجروں سے بھی بہت سے تحفے تحائف وصول کئے تھے۔ اس کے بعد ان معاملات کے انکشاف سے قبل ۱۹۲۳ء میں اس نے ملازمت سے استعفا دے کر ایک وسیع جائداد خرید لی۔ جس کی قیمت اس نے ان نام نہاد "قرضوں" سے ادا کی تھی جو اس نے سن کلیر اور ڈوھنی سے حاصل کئے تھے۔

استنباطِ نتائج

جیسا کہ ہم اس کتاب کے حصّہ اول میں بتا چکے ہیں قرآن کریم افراد و اقوام کی اخلاقی، معاشی اور سماجی خرابیوں کی بنیادی وجہ یہ بتاتا ہے کہ قومیں اور ان کے افراد تملیکی جذبات (ANQUISITIVE DESIRES.) کے غلبہ سے متاثر ہو کر حیاتِ برتر کا بلند تصوّر کھو بیٹھتے ہیں اور زندگی کے کسی ادنیٰ تصوّر کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز قرار دے لیتے ہیں۔ اس ادنیٰ تصوّرِ زندگی کو قرآن متاعِ دنیا سے موسوم کرتا ہے اور حیاتِ برتر کے تصوّر کو وہ آخرت کے نام سے یاد کرتا ہے کیونکہ اعلیٰ تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور بلند تر مقاصد کے لئے جد و جہد کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں یا یوں کہئے کہ ان کے ظہور میں تاخیر ہوتی ہے اور آخرت کا لفظ اسی عمل تاخیر پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن اسی ادنیٰ تصوّرِ حیات کا نقشہ کھینچتے ہوئے لوگوں کو ایک بہتر اور بلند تر تصوّرِ حیات کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ
مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ
وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ
الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ
الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ
وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ
حُسْنُ الْمَآبِ ۔ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ

لوگوں کے واسطے زینت رکھ دی گئی
ہے خواہشات (ادنیٰ) کی محبت میں جو
حسن نسوانی۔ اولاد۔ سونے چاندی کے
ڈھیروں۔ نشان زدہ گھوڑوں، چوپایوں
اور کھیتوں کی محبت میں ظاہر ہوتی ہے۔
یہ ایک ادنیٰ زندگی کی متاع ہے۔ اور
اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے
کہو کیا میں تمہیں کچھ اس سے بھی بہتر چیزیں

بخیر من ذالکم للذین
اتقو عند ربھم جنت
تجری من تحتھا الانھار
فیھا ازواج مطھرۃ
ورضوان من اللہ واللہ
بصیر بالعباد۔ الذین
یقولون ربنا اننا امنا
فاغفرلنا ذنوبنا وقنا
عذاب النار۔ الصبرین
والصدقین والقانتین
والمنفقین والمستغفرین
بالاسحار

بتاؤں جو ان لوگوں کے لئے ہیں جو خدا کے
قانون مکافاتِ عمل سے ڈرتے ہیں۔ یہ ہیں
باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں
پاک بیویاں ہیں اور اللہ کی رضا اور خوشنودی
ہے اور اللہ اپنے بندوں کے اعمال
سے خوب باخبر ہے۔ یہ چیزیں ان لوگوں کے
لئے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم
ایمان لائے تجھ پر تو ہمارے گناہوں کو معاف
فرما اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا لے۔
(اپنے مقصد کی جد و جہد میں) صبر کرنے
والے اپنے اعلانات اور اقوال کو سچ
کر دکھانے والے (اپنے مقصد کے)
اطاعت شعار اور فرمانبردار اور (اپنے
مقصد کے لئے) روپیہ پیسہ خرچ کرنے
والے اور صبح کے وقت خدا سے معافی
مانگنے والے۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم مال و دولت کی محبت۔ اراضی اور جائداد کی طلب۔ شہوانی الفت کے شغف و انہماک اور کثرت اولاد کی خواہش کو مجموعی حیثیت سے "متاع دنیا" قرار دیتا ہے اور جو لوگ صرف انہیں چیزوں کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان سے کہتا ہے کہ زندگی کے اس سے اعلیٰ تر مدارج اور بلند تر مقاصد بھی موجود ہیں جن کی طرف تمہیں بڑھنا چاہیئے۔ پھر وہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو متاع دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت یعنی کسی برتر اور ویر طلب تصور حیات کے لئے زندگی گزارتے ہیں۔ ان صفات کا نقشہ کھینچتا ہے جو آخرت کے طلبگار وں ل

میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متاعِ دنیا کے طلبگاروں پر تملیکی جذبات (ACQUISITIVE DESIRES) کا غلبہ ہوتا ہے اور آخرت یعنی حیاتِ برتر کے متلاشیوں پر تعمیری اور تخلیقی جذبات حاوی ہوتے ہیں۔ کیونکہ حسنِ نسوانی سے لذت اندوزی کی خواہش اور زمین و جائداد یا زر و سرمایہ کے حصول کا شوق انسان پر تملیکی جبلتوں کے غالب آجانے سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کسی اعلیٰ روحانی مقصد کے لیے اپنا مال و سرمایہ اسی وقت خرچ کرتا ہے اور اس کی راہ میں صبر اور سچائی کی صفات کا اظہار بھی اسی صورت میں کرتا ہے۔ جب اس پر تخلیقی جذبات اور تعمیری خواہشات پوری طرح تسلط پالیتی ہیں۔

یہی فرق زوال پذیر اور ترقی پذیر قوموں کا بھی ہے۔ جو قومیں رو بہ انحطاط ہوتی ہیں ان کے افراد پر زندگی کا کوئی ادنیٰ تصور حاوی ہو جاتا ہے جو ان کے تعمیری جذبات اور تخلیقی جوش کو افسردہ اور تملیکی جذبات کو بیدار کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیوی آسائش کی خواہش روپیہ پیسہ کی محبت۔ اولاد و ازدواج کی خصوصاً حسنِ نسوانی کی طلب اور اس سے لذت اندوزی کا شوق، نمود و نمائش کا جذبہ، شان و ترفع کا چسکا اور اسی قسم کے دیگر محرکات ان کی زندگی اور سیرت کی تشکیل کرنے لگتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جو قومیں مائل بہ ترقی ہوتی ہیں۔ ان کے افراد تملیکی جذبات سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ البتہ ترقی پذیر قوموں میں تعمیری جذبات اور تخلیقی محرکات خالص تملیکی خواہشات کے مقابلے میں اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ آخر الذکر صفات کو ابھرنے اور زور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ کیونکہ قوم کی قوم حیاتِ برتر کے کسی نہ کسی تصور میں اس طرح مگن اور سرشار ہوتی ہے کہ تملیکی جذبات زور کرنا چاہیں بھی تو تخلیقی محرکات کا جوش انہیں ایک سیل بے پناہ ۔۔۔۔۔۔

کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

قرآن نے زوال پذیر قوموں کی جن خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے اور جنکی تفصیلی کیفیت ہم حصہ اول میں بیان کر چکے ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سب ایک اصل کی پیداوار ہیں اور یہ اصل وہی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے مذکورہ بالا آیت میں توجہ مبذول کرائی ہے۔ یعنی مال و دولت اور لذت و آسائش کی طلب یا تملیکی جذبات کا شور و شر مثلاً قرآن نے تباہ شدنی اقوام کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ انکے اندر شدید قسم کی طبقاتیت پائی جاتی ہے اور ان کے مالدار اور متمول طبقات اپنے غریب اور کمزور ہم قوموں کو حقارت و تذلیل کی نظر سے دیکھتے ہیں

وما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای۔ — اور ہم نہیں دیکھتے ہیں کہ بجز ذلیل اور ہلکے قسم کے لوگوں کے اور کسی نے تیری بات مانی ہو۔

یا اس نے زوال پذیر قوموں کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان میں استکبار اور اتراف کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں یعنی اپنی خوشحالی اور اپنے مال و دولت کا غرور ہوتا ہے اور وہ قوم کے پست تر طبقات یا محکوم اقوام کے مقابلہ میں اپنی شان و شوکت اور دنیوی وجاہت کا اظہار کرنے لگتے ہیں جس سے غریب اور متوسط طبقات کے دلوں میں ایک احساسِ ذلت پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ آبا و اجداد کی اندھی تقلید بھی زوال آمادہ قوموں کی ایک صفت ہوتی ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ جو قومیں تباہ ہونے والی ہوتی ہیں۔ ان کے اندر ظالم و جابر اور غیر منصف مزاج حکمرانوں کا مقابلہ کرنے یا ان کی مزاحمت کرنے کا مادہ فنا ہو جاتا ہے اور وہ ہر قسم کی لیڈرشپ کو خواہ اچھی ہو یا بری طوعاً و کرہاً قبول کر لیا کرتی ہیں۔ اب اگر ان ساری صفات میں کوئی قدر مشترک تلاش کی جائے اور ان کا کوئی واحد قانون دریافت کیا جائے جس سے یہ مختلف صورتوں میں سرزد ہوتی ہیں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ مختلف صفات اور متفرق کمزوریاں

اسی ایک اصل سے پیدا ہوتی ہیں جسکو قرآن حبّ الشہوات سے تعبیر کرتا ہے بالفاظ
دیگر تملیکی جذبات کا غلبہ قوموں کے اندر یہ تمام کمزوریاں پیدا کرتا ہے۔ جب تک
قوم میں تعمیری اور تخلیقی جذبات کا پلہ بھاری رہتا ہے نہ دولتمندوں میں غرور و
استکبار کی صفت پائی جاتی ہے اور نہ غریبوں میں احساس کمتری کا کوئی شائبہ
نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ سب مل کر ایک مشترکہ تخلیقی مقصد کے لئے جد و جہد کر رہے
ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی مشترکہ جد و جہد کے دوران میں اونچ نیچ، غریبی امیری
اور چھوٹے بڑے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تقلید آبا اور جمود
کے اوصاف جو عقل و فکر کی قوتوں کے ضعف کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس
بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اب افراد قوم کے سامنے کوئی تخلیقی مقصد نہیں رہا ہو
جو انہیں قوائے عقلی کے استعمال پر ابھارے اور بدلتے ہوئے حالات میں حصول
مقصد کے نئے نئے ذرائع اور وسائل تلاش کرنے پر مجبور کرے۔ غلط لیڈروں
اور جابر و سرکش سلطنتوں کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا مرض بھی اصل میں تملیکی جذبات
کے فروغ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب لوگوں میں مال و دولت اور دنیوی اعزازات
و مناصب کی الفت بڑھ جاتی ہے تو ملک کے معاشی وسائل پر قبضہ و اقتدار
رکھنے والے افراد و طبقات ان کی حرص و ہوس اور زر طلبی سے فائدہ اٹھا کر
اور اُن میں روپیہ پیسہ عہدے اور مناصب تقسیم کر کے انہیں ضمیر فروشی پر آمادہ
کر لیتے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں چونکہ معاشی قوت اور فوجی طاقت لازم و ملزوم تھی
اس لئے جو لوگ فوجی حیثیت سے طاقتور ہوتے تھے انہیں کے ہاتھ میں ملک
کے معاشی وسائل بھی ہوتے تھے اور یہی لوگ سوسائٹی کے ہنگامہ خیز اور
ناعاقلانہ عناصر کو روپیہ پیسہ اور رشوتیں کھلا کر یا ڈرا دھمکا کر اپنا ہمنوا بنا لیتے
تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ دیدہ و دانستہ ان کی غلط اور مضرت رساں
پالیسی کی تائید کر کے ضمیر فروشی کرتے تھے اور اپنے اعلیٰ تر جذبات قومی یا
مذہبی احساسات کو دبا دیتے تھے۔ جب تک قوم کا ضمیر بیدار رہتا ہے اور اس

کے افراد قومی اور اخلاقی فوائد کے مقابلہ میں دنیوی عزت ۔ عہدوں اور مال و دولت کی پرواہ نہیں کرتے ۔ اس وقت تک کوئی جابر حکمران یا غلط قسم کا سیاسی لیڈر ان کا امیر اور قائد نہیں بن سکتا ۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ زوال پذیر قوموں کی تمام صفات رذیلہ بالآخر ایک ہی اصل اور سرچشمہ سے پھوٹتی اور ظاہر ہوتی ہیں یعنی تملیکی جذبات کی شدت اور افراد پر ان کا قاہرانہ تسلط !

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رومی اور مغربی تہذیب کے جو حالات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان سے قرآن کریم کے اس نقطۂ نظر کی کہاں تک تصدیق ہوتی ہے اور قرآن کے بیان کردہ قوانین تاریخ کا اطلاق رومیوں اور مغربی قوموں پر کہاں تک عمل میں آسکتا ہے ۔

جہاں تک سلطنت روما کا تعلق ہے اس کی اخلاقی کمزوریاں جولیس سیزر (JULIUS CAESAR) ماریس (MARIUS) اور سلا (SULLA) کے زمانہ سے منظرِ عام پر آنا شروع ہوئیں ۔ اس سے قبل روم کا ہر فرد اپنے ملک کا سپاہی تھا وہ اپنی قوم کی مدافعت اور مفاد کی حفاظت کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہتا تھا اور محض روپیہ پیسہ یا شہرت و اعزاز کی خاطر یہ کام نہیں کرتا تھا ۔ جیسا کہ گبن (GIBBON.) کے بیان سے ظاہر ہے رومی سلطنت کی توسیع سے قبل رومیوں میں انفاقِ مال یعنی اجتماعی ضروریات کے لئے اپنی دولت خرچ کرنے کا اتنا جوش تھا کہ انہوں نے بغیر کسی خارجی جبر اور دباؤ کے پوری رضا و رغبت کے ساتھ رومی افواج کے اخراجات و مصارف کا بار اپنے سر لے لیا حالانکہ ان کی معاشی حالت ابھی تک نہایت کمزور تھی ۔ لیکن ماریس سلا ، سیزر کے زمانہ میں یہ صورت حال باقی نہیں رہی ۔ ان آمروں کے قبضۂ اقتدار میں ایک پیشہ ور اور زر پرست فوج تھی جس کو بیش قرار تنخواہیں اور بڑے بڑے اعزازات و مناصب دے کر یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لئے کام میں لانے لگے تھے اس کے معنی یہ تھے کہ اب روم کے شہری قومی اغراض یا تخلیقی مقاصد کے لئے

نہیں بلکہ اپنی ذاتی بڑائی ترقی اور خوشحالی کے جذبہ سے متاثر ہو کر کام کرنے لگے تھے اور اُن میں یہ قابلیت اور دیانت باقی نہیں رہی تھی کہ جن مقاصد سے قوم کا مجموعی مفاد وابستہ نہ ہو ان کے لئے محض روپیہ پیسہ اور دولت و اعزاز کی خاطر اپنا خون پسینہ بہانے سے انکار کر دیں۔ اس طرح دولت۔ دنیوی اعزاز و اکرام کی طلب یا قرآنی اصطلاح میں حب الشھوات نے قوم کے شجاع اور جنگجو افراد پر اتنا غلبہ پالیا تھا کہ روم کے ان تینوں ڈکٹیٹروں نے نہایت آسانی سے انہیں اپنے ذاتی اور گروہی اغراض کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

رومی ذہنیت میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا اور رومی قوم تعمیری جذبات سے عاری ہو کر تخریبی جذبات کا کیونکر شکار ہو گئی۔ اس کی وجہ وہی تھی جس کی طرف قرآن نے توجہ مبذول کرائی ہے یعنی مال و دولت کی کثرت اور اتراف یعنی خوشحالی کا غرور جب سے روم کو پے در پے فوجی فتوحات نصیب ہونی شروع ہوئیں اس ملک میں مفتوحہ علاقوں کی دولت کھنچ کھنچ کر جمع ہونے لگی۔ رومی سپاہی جو ابتداء میں کاشتکاری کا پیشہ کرتے تھے اب دولت اور فوجی مناصب و اعزازات کے غرور میں مبتلا ہو کر زراعت اور کھیتی کے پیشہ کو ذلیل سمجھنے لگے اس لئے انہوں نے اپنی اراضی امیروں کے ہاتھ فروخت کر دیں اور خود مال غنیمت اور سرکاری تنخواہوں پر زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روما کے ملک میں چھوٹے چھوٹے کسانوں کا وجود عملاً ختم ہو گیا اور اُن کی تمام زمینیں چند افراد کے ہاتھ میں آگئیں جس سے زمینداروں اور جاگیرداروں کا ایک مفت خور طبقہ پیدا ہو گیا۔ رومی سنات کے متمول ارکان نے چھوٹی چھوٹی زمینات کو خرید کر کے انہیں بڑی بڑی جاگیروں میں تبدیل کر دیا اور مفتوحہ ممالک سے جو لاتعداد غلام روم میں داخل ہو گئے تھے۔ اُن سے اُن جاگیرات پر مفت کام لینے لگے۔ اس طرح روم میں رفتہ رفتہ طبقاتیت کی وہ شدت پیدا

ہوگئی۔ جس کو قرآن کریم نے زوال پذیر قوموں کا ایک نمایاں وصف قرار دیا ہے اسی طبقاتیت کی خرابیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ٹائیبیریس گریکس (TIBERIUS GRACHHUS.) نے ۱۳۳ء ق م میں جبکہ وہ ٹرائیبون (TRIBUNE) کی خدمت پر مامور ہوا بڑی سخت جدو جہد کی لیکن رومی سینیٹ کے جاگیردار ارکان کی مخالفت نے اس کی تمام تدابیر اور کوششوں کو ناکام بنا دیا بلکہ انہیں لوگوں کی عداوت اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اسے ایک ہنگامے کے دوران میں قتل کر دیا گیا۔ ادھر ٹائیبیریس اور اس کا بھائی گائس گریکس GAIUS GRACCHUS روم کی بڑھتی ہوئی طبقاتیت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا ادھر بروٹس اور دوسرے جمہوریت پسند عناصر جولیس سیزر وغیرہ کی ترقی پذیر آمریت کا مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جولیس سیزر کے بعد جب اس کا بھتیجا آگسٹس تخت نشین ہوا تو اس نے جمہوری روایات کا ظاہری احترام رکھتے ہوئے سلطنت کو بالکل آمرانہ طرز پر ڈھال لیا۔ رومی تاریخ کے اس دور میں اگرچہ سلطنت پر آثار زوال طاری ہوگئے تھے لیکن چونکہ اس کے مقابلہ کی کوئی قوم دنیا بھر میں موجود نہ تھی اس لئے وہ عرصہ دراز تک تباہی سے محفوظ رہی کیونکہ ابھی تک رومی سوسائٹی بروٹس اور گریکس برادران GRACCHI BROTHER جیسے اشخاص سے خالی نہیں تھی جو ہر قسم کے خطرات اور نقصانات کا سامنا کرکے وقت کی برائیوں اور حکومت کی خرابیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کو تیار تھے۔ یہاں تک کہ قوم کی اصلاح کے لئے وہ اپنی جان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے جب تک کسی قوم میں یہ صفت باقی رہتی ہے کہ اس کے ایماندار اور صالح افراد گردوپیش کی برائیوں کو خاموشی سے گوارا نہیں کرتے اور نہ مسجدوں یا خانقاہوں میں گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں بلکہ ان کے خلاف زبان و قلم اور جان و مال سے جہاد کرتے رہتے ہیں اس وقت تک قوم زوال و بربادی سے محفوظ رہتی ہے۔

اسی بات کو قرآن کریم نے یوں بیان فرمایا ہے :-

فلولا کان من القرون من قبلکم اولو بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منھم واتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیہ وکانوا مجرمین

پھر تم سے پہلی آبادیوں میں اچھے عمل والے لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں لوگوں کو فساد اور بد اعمالی سے روکتے۔ البتہ تھوڑے لوگ ایسے تھے جنہیں ہم نے نجات دی لیکن (عام طور پر) جو لوگ ظالم تھے وہ ان آسائشوں کے پیچھے پڑے رہے جو انہیں دی گئی تھیں اور یہی لوگ مجرم تھے۔

قرآن کریم کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو قومیں تباہ ہونے والی ہوتی ہیں ان میں ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے جو اپنی قوم اور بالخصوص اس کے مالدار اور خوشحال طبقات کو ظلم و ستم اور عیش و عشرت سے روک کر صحیح راستہ پر لاسکیں۔ چنانچہ آگے چل کر رومی قوم کا بھی یہی حال ہو گیا کہ اس میں نہ تو کوئی بروٹس پیدا ہو سکا جو رومی شہنشاہوں کو مطلق العنانی سے روکتا اور نہ کوئی ٹائبیریس یا گائیس گریکس میدان عمل میں آیا جو روم کے مالدار طبقات کو معاشی ظلم و ستم اور عیش پرستی کی عادات پر تنبیہ اور تہدید کرتا۔

گبن کے بیان کے مطابق آغسطس نے اپنے عہد حکومت میں جمہوری روایات اور ادارہ جات کا بڑا احترام ملحوظ رکھا لیکن یہ محض دھوکا تھا۔ آغسطس نے دراصل اپنی حکومت کی بنیاد آمریت اور مطلق العنانی کے اصولوں پر استوار کی تھی اور جمہوریت کی روح روم کے باشندوں میں بالکل فنا ہو چکی تھی یہ صورت حال اسی ظاہر پرستی سے وجود میں آئی تھی جو زوال پذیر قوموں کو ظواہر و شعائر کی پرستش میں گرفتار کر کے انہیں قومی اور مذہبی اصولوں کی روح اور قوانین و ضوابط

کے اصلی مقصد و منشاء سے بیگانہ کردیتی ہے۔ ظاہر پرستی کی علامات مذہب و اخلاق کے شعبہ کی طرح سیاست و معیشت اور تمدنی زندگی کے دائروں میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ روم کے سیاسی نظام کا روگ بھی یہی تھا کہ بظاہر اس کا طرز و انداز جمہوری تھا۔ لیکن حقیقت میں اس کا خمیر مطلق العنانی اور آمریت سے تیار ہوا تھا۔ سنات کی طاقت برائے نام رہ گئی تھی، روم کے مجسٹریٹوں اور دوسرے جمہوری عہدہ داروں کا کوئی اختیار و اقتدار باقی نہیں رہا تھا۔ ساری طاقت آغسطس کے ہاتھ میں تھی جو اپنے آپ کو پرنسیپس (　　　　) یعنی پہلا شہری کہتا تھا لیکن اصل میں ایک مطلق العنان اور جابر حکمران تھا۔ یہی بات ہم نے فرانس کے حالات میں بھی بیان کی ہے۔ اس ملک میں بھی ۱۹۴۰ء کی شکست سے قبل صرف ایک ظاہری اور رسمی جمہوریت باقی رہ گئی تھی۔ اصل اقتدار چند بڑے بڑے بینک کاروں (　　　　) کے ہاتھ میں تھا۔ ویسے تو فرانس میں پارلمنٹ بھی موجود تھی۔ سیاسی پارٹیاں بھی کام کر رہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً انتخابات بھی منعقد ہوا کرتے تھے اور بظاہر فرانس کا پریس بھی آزاد تھا لیکن ان سارے اداروں کے اندر کوئی حقیقت اور اصلیت باقی نہ تھی۔ یہی حالت آج خود ہماری اپنی قوم کی بھی ہے۔ ہمارا دین چند خارجی رسوم وضوابط اور ظاہری عبادات و شعائر کا مجموعہ بن گیا ہے۔ ویسے تو ہمارے یہاں نماز اور روزوں کا کافی چرچا ہے۔ مذہبی قوانین کی ظاہری پابندی بھی کی جاتی ہے۔ میلاد کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ یوم عمر۔ یوم صدیق یوم علی اور یوم حسین بھی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن یہ سب ظاہری پردے ہیں جن کو اٹھا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دینداری کی اصل روح اور تقویٰ کی اصل حقیقت ہمارے اندر سے فنا ہو چکی ہے۔ اسی وجہ سے ہم قوانین مذہب کے مقصد و منشا کو اہمیت دینے کے

بجائے ان کے ظاہری الفاظ سے چمٹے ہوئے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان قوانین کی رسمی پابندی سے ہماری قوم کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ نجات مل جائے گی۔

رومی تاریخ میں "حب الشہوت" کا ایک اور مظاہرہ اس وقت عمل میں آیا جب جنسی خواہشات کے غلبہ نے روم کے بادشاہوں اور امیروں کو اپنی بیویوں اور داشتہ عورتوں کا آلہ کار بنا دیا۔ یہ کیفیت انطونی ( ) کے وقت سے شروع ہو گئی تھی جس کی عشق و عاشقی کے افسانے زبان زد عام تھے حسن نسوانی کی دنیا میں قلوبطرہ کو جو شہرت دوام حاصل ہوئی وہ اسی رنگین مزاج رومی حاکم کا عطیہ تھا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ آغسطس نے محض اپنی بیوی کے عشق میں سلطنت کی جانشینی کے مسئلہ کو ایک عورت کی مرضی کے سپرد کر دیا۔ پھر کموڈس نے حسن و عشق کی دنیا میں جو یادگاریں چھوڑیں ان سے رومی تاریخ کے صفحات اب تک مزین ہیں غرضیکہ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا روم کے امراء اور عوام دونوں پر شہوانی جذبات کا تسلط بڑھتا گیا اور ان کا جنسی اخلاق روز بروز گرتا گیا یہاں تک کہ رومی مورخ ٹیسی ٹس روم کے بڑے بڑے خاندانوں کے تعیش اور شہوت پرستی کا حال بیان کر کے حسرت سے کہتا ہے کہ جرمنی کے وحشی قبائل کی عورتیں رومی شرفاء کی عورتوں کے مقابلہ میں عفت و پاکدامنی اور عصمت و پرہیزگاری کا نمونہ ہیں۔ شہوت پرستی کی یہ وبا قوموں میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کی دولت و ثروت میں خوب اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگوں کی آمدنیاں ان کی حقیقی ضروریات سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ چونکہ لوگوں کے اندر تعمیر و تخلیق کا جذبہ باقی نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی زائد دولت کو قومی اور اجتماعی ضروریات پر صرف کرنے

کے بجائے مزید آمدنی پیدا کرنے میں استعمال کرتے ہیں یا اپنے فاضل
روپیہ پیسہ کو زینت و آرائش اور شہوت پرستی پر خرچ کرتے ہیں۔ ایسے
ہی زمانہ میں رقص و سرود کی محفلیں خوب زور شور سے گرم ہوتی ہیں۔
بے فائدہ کھیلوں اور تماشوں کی کثرت ہوتی ہے۔ زینت و آرائش اور
عیش و عشرت کے تمام اسباب و وسائل خوب ترقی کرتے ہیں۔ کیونکہ
ان سب چیزوں کی کثرت درحقیقت انسان کے جذبہ شہوانی کی بے راہ
روی سے ظہور میں آتی ہے۔ جب تک تعمیر و تخلیق کا جوش قوموں پر غالب
رہتا ہے اس کے اثر سے ان کے شہوانی اور تخلیقی جذبات میں اعتدال
قائم رہتا ہے۔ ناچ اور رنگ کھیل اور تماشے اور زینت و آرائش کے
تمام مظاہر حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھنے پاتے لیکن جب دولت کی
کثرت اور مال کی محبت کے باعث قوم کی تخلیقی امنگیں سرد پڑ جاتی ہیں تو
عیش و بوالہوسی اور شہوانیت کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ اسباب
عیش اور وسائل زینت کو خوب ترقی ہوتی ہے اور قوم کی زندگی تعمیر و
تخلیق کی ایک مسلسل جدو جہد کے بجائے عیش طلبی اور لذت پرستی
کی ایک طولانی داستان بن جاتی ہے۔ پھر اس کے اثرات قوم کی سیاسی
اور معاشی زندگی پر بھی پڑنے لگتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں شہوت پرستی
کے یہ تمام مظاہر و علامات اور عورتوں کا سیاست میں عمل دخل اسی وقت
شروع ہوا جبکہ مسلمانوں کی سلطنت وسیع ہو گئی اور ان کی دولت و خوشحالی
میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ بنو امیہ کے دور تک ہمیں اسلامی تاریخ میں کوئی
ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی خلیفہ نے حسن نسوانی کے اثرات کو سلطنت
کے مسائل میں داخل کیا ہو۔ اس قسم کا پہلا واقعہ عباسیوں کے دور
میں ہوا جبکہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ سلطنت کے معاملات میں
دخیل ہونے لگی۔ اسکے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا عباسی خلفاء کی بیویاں

اور لونڈیاں انکی سیاست پر اثر انداز ہونے لگیں۔ انگلستان کی تاریخ سے بھی ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس ملک کی سیاسیات میں ۱۹۱۸ء تک عورتوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ انگلستان میں بیس سال سے زائد عمر کی عورتوں کو حق رائے دہی دیا گیا پھر ۱۹۲۸ء میں اس حق کی توسیع کی گئی اور (۲۱) سال یا اس سے زیادہ عمر والی عورتوں کو بھی انتخابات میں رائے دینے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح انگلستان کی تاریخ کے اس عہد میں جو اس کے اصلی فروغ و ترقی کا زمانہ تھا عورتیں سیاست سے الگ رہیں لیکن جب انگلستان پر زوال اور انحطاط کا دور شروع ہوا تو اس ملک کی عورتیں براہ راست سیاست کے میدان میں اتر آئیں۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا۔ کہ عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے یا نہ لینے سے قوم بگڑتی یا بنتی ہے۔ کیونکہ فرانس میں آخر وقت تک عورتوں کو حق رائے نہیں دیا گیا اس کے باوجود فرانس زوال و تباہی کی مصیبت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عورتوں کا سیاست میں حصہ لینا یا نہ لینا قومی زوال کے موجبات میں ہے یا نہیں بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر شہوانی جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی پالیسی میں نسوانی اثرات داخل ہو جاتے ہیں اور اہم معاملات کے تصفیہ میں حکمران گروہ ملکی مفاد اور قومی اغراض کے بجائے اپنے شہوانی علائق اور نسوانی تعلقات سے متاثر ہونے لگتا ہے جسکی وجہ سے اسکی سیاست ایماندارانہ نہیں رہتی۔ اگر قوم پر شہوانی جذبات کا غلبہ نہو اور وہ بدستور تعمیری اور تخلیقی امنگوں سے سرشار رہے تو سیاست اور معیشت کے میدان میں عورتوں کے داخلہ سے وہ برے نتائج اور اثرات نہیں پیدا ہوتے ہیں جنکا مظاہرہ روما کی تاریخ، مسلمان سلاطین

کی سیاست اور فرانس کی حالیہ شکست کے واقعات ہیں ہو چکا ہے۔
رومی تاریخ کے آخری دور میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح اس شجاع اور بلند ہمت قوم کے افراد مال و دولت کی کثرت اسباب عیش و زینت کی فراوانی اور شہوت پرستی کی عادات کے باعث اتنے کمزور اور بزدل ہو گئے کہ وہ وحشی جرمنوں کے مقابلہ میں اپنی سلطنت کی مدافعت کرنے کے قابل نہیں رہے حالانکہ یہ وحشی جرمن قبائل معاشی حیثیت سے مفلس فوجی اعتبار سے غیر مسلح اور تہذیب و تمدن کے نقطہ نظر سے پسماندہ تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی میں سادگی تھی اور وہ عیش و عشرت سے ناآشنا ہونے کے باعث سخت جان۔ جفاکش اور جنگجو تھے اسلئے وہ رومیوں کی کثرت اور طاقت کے باوجود رفتہ رفتہ ان پر غالب آ گئے۔ پہلے تو رومیوں کو اپنی سرحدات کی حفاظت کے لئے انہیں اقوام کے نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا پڑا۔ پھر جب فوج میں وحشی جرمنوں کی تعداد بڑھ گئی اور ان کو آرام و آسائش کے وہی وسائل حاصل ہو گئے جو رومیوں کو حاصل تھے تو ان کے اندر بھی پہلی سی فوجی طاقت باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے یہ زر خرید سپاہی بھی سلطنت کو اندرون جرمنی کے وحشی قبائل کے حملوں سے نہ بچا سکے۔ بلکہ ان کے ساتھ ملکر انہوں نے سلطنت روما کا خاتمہ کر دیا۔ اس غریب غیر متمدن جفاکش۔ مال و دولت سے محروم اور اسباب عیش و زینت سے ناآشنا قوم کی رومیوں کے بالمقابل وہی حالت تھی جو فرعون اور اسکی مالدار اور عیش پرست قوم کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ اور انکی بے مایہ قوم کی تھی اور یہ لوگ بھی رومیوں کے غرور و نخوت اور ان کے استکبار کا جواب انہیں الفاظ میں دے سکتے تھے جن میں حضرت موسیٰ نے فرعون کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اس کی شکست کی پیشن گوئی کی تھی۔

ربنا انک اتیت فرعون وملاءہ زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک — اے ہمارے رب تونے فرعون اور اسکے سرداروں کو دنیوی زندگی کی دولت اور زینت عطا کی ہے ۔ یہ اسلئے ہے کہ تو انہیں اپنے راستہ سے دور ہٹادے ۔

اور بالکل انہیں الفاظ میں چین کے موجودہ کمیونسٹ جو معاشی حیثیت سے کمزور فوجی حیثیت سے غیر مسلح ۔ اسباب زینت کے نقطہ نظر سے بے مایہ اور سامان عیش کے لحاظ سے تھی دامن ہیں امریکہ اور برطانیہ کی فرعونی طاقتوں سے کہہ سکتے ہیں ۔

ربنا انک اتیت فرعون وملاءہ زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک — اے ہمارے رب تونے فرعون اور اسکے سرداروں کو دنیوی زندگی کی دولت اور زینت عطا کی ہے یہ اسلئے ہے کہ تو انہیں اپنے راستہ سے دور ہٹادے ۔

دولت اور کثرت عیش کی وجہ سے قومیں سچائی کی راہ سے بھٹک جاتی ہیں کیونکہ دولتمند اور خوشحال قومیں ہمیشہ معاملات کے تصفیہ اور حالات کے جائزہ میں اخلاقی عوامل کو نظر انداز کردیتی ہیں ۔ مادی اور معاشی عوامل کو مبالغہ آمیز اہمیت دینے کی وجہ سے ان قوموں کی سیاست بھی بگڑ جاتی ہے مالی اور اقتصادی طاقت کے غرور میں ایسی قومیں انسانوں کے اصلی اخلاقی اوصاف کو جن پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے بہت کم اہمیت دیتی ہیں ۔ ان کا نقطہ نظر جسطرح معاشرت اور اخلاق کے مسائل میں غلط ہوتا ہے ۔ اسی طرح واقعات تاریخ اور احوال سیاست کی سوجھ بوجھ بھی ان میں کم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ معاشی وسائل کی کثرت اور آلات حرب کی فراوانی سے عقیدہ کی کمزوری اور اخلاقی خرابیوں کی تلافی ہوسکتی ہے حالانکہ اخلاق کی کمزوریوں اور عقیدہ کی کوتاہیوں کا کوئی بدل آج تک

نہیں پیدا کیا جا سکا اور نہ آئندہ کوئی پیدا کر سکتا ہے۔
رومی تہذیب کے دورِ زوال میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں انہوں نے رومی سلطنت کو یکدم تباہ نہیں کیا بلکہ یہ عظیم الشان قوم عرصہ دراز تک زمین کے ایک غالب حصہ پر حکمران رہی۔ رومی سلطنت کے دیرپا ہونے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ رومی قوم اُن قومی اور نسلی تعصبات سے آزاد تھی جن میں آجکل کی مغربی اقوام مبتلا ہیں۔ رومی اپنی محکوم اقوام کو سیاسی اور معاشرتی حقوق عطا کرنے میں بڑے فیاض تھے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۲۰۱ء میں کیرا کلا (   ) نے تمام صوبوں کے باشندوں کو رومی شہریت کا حق دیا جس کے بعد وہ جوق در جوق رومیوں کے فوجی اور سول عہدوں پر مامور ہوتے گئے۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شہنشاہوں کے انتخاب میں بھی رومیوں نے کالے گورے یا رومی اور غیر رومی کا تعصب نہیں برتا۔ ان کا ایک شہنشاہ شامی۔ ایک عرب اور ایک افریقی تھا۔ کئی ایک رومی فرمانروا اسپین کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح جب رومیوں کی ذہنی اور سیاسی صلاحیتیں کمزور پڑیں تو سلطنت کی محکوم اقوام کے قابل افراد انکے تہذیب و تمدن اور ان کی حکومت کی خدمت کے لئے آگے بڑھ آئے۔ اگر رومی ان لوگوں کو یکساں موقع نہ دیتے یا ان سے مساوات کا سلوک نہ کرتے تو رومی سلطنت بہت جلد اپنی اندرونی خرابیوں کا شکار ہو جاتی۔ یہی بات مسلمانوں کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اگر اسلام نے عرب اور عجم کا فرق کیا ہوتا اور مسلمانوں کے معاشرہ میں کالے گورے یا خون اور نسل کا امتیاز برتا جاتا یا غیر عرب مسلمانوں کو عربی مسلمانوں کے مساوی درجہ نہ ملتا تو بنو امیہ کے بعد اسلامی تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایرانیوں۔ ترکوں اور مغلوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے اسلامی تہذیب کو جو فوائد حاصل ہوئے اور ان قوموں کے قابل افراد نے اسلام کی جو خدمات انجام دیں ان کا تاریخ میں کوئی نشان نہ ہوتا اگر اسلام نے

اپنے دین کو قومی اور نسلی امتیازات سے پاک نہ کر دیا ہوتا۔ بشمول امریکہ مغرب کی جدید اقوام پر اتنی جلد زوال آجانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان قوموں میں مساوات کی وہ اسپرٹ نہیں پائی جاتی ۔ جو مسلمانوں اور رومیوں میں موجود تھی۔ اس کے برخلاف ان قوموں میں نسلی اور ملکی تعصبات کا بڑا زور ہے اور یہ لوگ کسی صورت میں بھی محکوم اقوام کے ساتھ احترام و عزت اور مساوات کا سلوک کرنے پر تیار نہیں ہوتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور تہذیبوں کی ترقی اور پستی میں ایک فیصلہ کن عنصر یہ ہوتا ہے کہ آیا کوئی تہذیب و تمدن قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہے یا بین الاقوامی بنیادوں پر یعنی اقوام غیر کے لئے اس کی گود وسیع ہے یا تنگ جس تہذیب کے علمبردار غیر اقوام اور نسلوں کی امداد و تعاون کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مساوات اور اخوت کا سلوک کرتے ہیں ان کی تہذیب اور سلطنت دیر تک قائم رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نسل و خون اور رنگ و قوم کے امتیازات اٹھا دیئے اور اپنا دروازہ ہر قوم اور ہر نسل کے انسانوں کے لئے کھلا رکھا تاکہ کسی مخصوص قوم کے زوال پذیر یا تباہ و برباد ہونے سے اسلام کے مستقبل کو کوئی دھکا نہ پہنچے جب تک مسلمان اس وسیع النظری اور روح مساوات کا مظاہرہ کرتے رہے اور اسلام لانے کے بعد غیر قومیں انکے مساویانہ سلوک کی وجہ سے اپنے مرتبہ اور عزت میں نمایاں ترقی محسوس کرتی رہیں اس وقت تک مسلمانوں کی تہذیب ہر قوم کے بہترین افراد کی خدمات سے مستفید ہوتی رہی اور ان کی حکومت باوجود ہزار ہا خرابیوں اور بیشمار کمزوریوں کے زمین کے غالب حصہ پر قائم رہی۔

مغربی ممالک کے جو حالات ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کئے ہیں اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے اقوام و ملل کے زوال و انحطاط کی جو توجیہ اقوام ماسبق اور اپنے زمانہ کی تاریخ کے حوالہ سے کی ہے اس کا اطلاق موجودہ اقوام کی تاریخ پر بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے فرانس کی

حالیہ شکست کے اسباب سے بحث کریں گے جیسا کہ جنرل ویگان نے بجا طور پر اصرار کیا فرانس کی شکست کی ذمہ داری تنہا فوجی عہدہ داروں پر نہیں بلکہ اس کے نظام تعلیم و تربیت پر تھی۔ فرانس میں ایک عرصہ سے قومی جذبات سرد اور قومی عقائد کمزور پڑ گئے تھے اور فرانسیسیوں کی نئی نسل کو صرف پیٹ پالنے اور عہدے حاصل کرنے کیلئے مدارس اور کالجوں میں تعلیم دی جا رہی تھی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسیوں کے ذہن میں اپنی قومی زندگی کی اہمیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ زندگی کے مادّی اور لذّتی تصوّر کے سوا کسی اور تصوّر حیات سے نا آشنا تھے۔ پھر جس قوم کے نوجوانوں کا عقیدہ یہ ہو کہ ہم صرف کھانے پینے، سیر و تفریح کرنے، شہوانی لذات سے لطف اندوز ہونے، عہدے اور ترقیاں حاصل کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اس میں ایثار نفس جفاکشی اور جان و مال کی قربانی کی صلاحیت کیسے باقی رہ سکتی ہے اور وہ اقوام و ملل کی کشاکش اور تصادم میں کسطرح کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ افراد قوم میں تعلیم و تربیت، پروپاگنڈا اور شخصی کردار کی مثال سے کوئی ایسا طاقتور عقیدہ پیدا کیا جائے جو انہیں زندگی کے مادّی اور لذتی تصور سے نکال کر اعلیٰ تر اقدار حیات سے آشنا کر سکے جس قوم میں آخرت کا تصور کمزور پڑ جائے یعنی جسکو زندگی کے فوری مسائل اور جزوی ضروریات سے اتنی زیادہ دلچسپی ہو کہ وہ آئندہ کی فکر کرنے سے معذور ہو جائے اور اسباب و حالات کے بعید تر نتائج پر غور کرنا ناپسند کرے اسکا دنیوی انجام جسکو قرآن آخرت سے تعبیر کرتا ہے یقیناً برا ہی ہو گا۔

قرآن نے جہاں جہاں کفار کی شکست اور تباہی کی پیشین گوئی کی ہے وہاں اس بات کی طرف صاف اشارہ کر دیا ہے کہ انکی تباہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُن میں زندگی کا کوئی صحت بخش عقیدہ نہیں پایا جاتا ہے وہ ایمان و یقین

کی روشنی سے محروم ہیں اور روزمرہ کی زندگی کے مسائل اور دلچسپیوں میں اتنے منہمک ہیں کہ انہیں زندگی کے بنیادی مسائل کی جن پر ان کے مستقبل کا دارومدار ہے کوئی پرواہ نہیں — چنانچہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے اور انکی فتح کی بشارت دیتے ہوئے قران لکھتا ہے۔

وان یکن منکم مائتہ یغلبون	اگر تمہارے سو آدمی ہوں تو وہ کافروں کے ہزاروں
الفاً من الذین کفروا بانھم قوم	پر غالب آسکتے ہیں کیونکہ کافر ایسی قوم سے تعلق
لا یفقھون	رکھتے ہیں جو سمجھ بوجھ سے خالی ہے۔

یہاں کافروں کے اسباب شکست میں سے ایک سبب کو واضح کرتے ہوئے قران لکھتا ہے کہ تم ان پر اس لئے غالب رہو گے کہ وہ ایک بے سمجھ قوم ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک روزمرہ کے مسائل زندگی مثلاً کھانے پینے۔ تجارت و زراعت اور اسی قسم کے معاملات کا تعلق تھا جن سے فوری فوائد مقصود ہوتے ہیں۔ کفار بھی کم از کم اتنے ہی سمجھدار تھے جتنے مسلمان۔ پھر وہ کون سی بے سمجھی ہے جسکے فقدان کی بابت قران کریم ہمیں توجہ دلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قران یہاں جس سمجھ کا ذکر کر رہا ہے وہ زندگی کے اصولی اور کلی مسائل سے متعلق ہے جنکے صحیح تصفیہ کا دارومدار افراد و اقوام کے عقیدہ حیات اور انکے نقطہ نظر پر ہے جو وہ زندگی کی حقیقت اور اسکے قوانین کے بارے میں قائم کرتے ہیں جس قوم کا عقیدہ حیات جتنا زیادہ پست اور ناقص ہو گا جسکا نقطہ نظر زندگی کے بنیادی قوانین کے بارے میں جتنا زیادہ غلط ہو گا وہ اپنی زندگی کے اہم مسائل اور معاملات کے تصفیہ میں اتنی ہی ٹھوکریں کھائے گی اور اتنا ہی زیادہ نقصان اٹھائے گی بس یہی بات فرانسیسیوں کے متعلق بھی صحیح ہے۔ انکے نوجوانوں میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ کوئی طاقتور عقیدہ نہیں پیدا کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کے فوری معاملات اور روزمرہ کے امور کی سمجھ بوجھ تو رکھتے تھے لیکن اپنی قوم کے مہمات مسائل پر انکی نظر نہ تھی

یہی وجہ ہوئی جو انہوں نے انقلاب فرانس کے سیاسی نعروں اور خالی خولی جمہوری آزادیوں کو قومی نجات کیلئے کافی سمجھا اور اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی طبقاتیت کی طرف انکی نظر نہ گئی بالفاظ دیگر ان میں یہ سمجھ نہ تھی کہ قومی زندگی کی طاقت کن عوامل پر مبنی ہوتی ہے اور کن عوامل سے قوموں میں کمزوری اور شکست پذیری کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اسیطرح فرانسیسی قوم میں عقیدہ کی کمی کے باعث یہ کیفیت بھی پیدا ہوگئی کہ وہ فوری نفع کے آگے انجام کو نہیں سوچتے تھے۔ انکی ساری سیاست بھی اسی مرض کا شکار تھی۔ مثلاً انہوں نے جرمنوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد اور مفلس و قلاش کرنے کی کوشش میں تاوان جنگ کا ناقابل برداشت بوجھ انکے سر پہ رکھ دیا۔ پھر جب وہ اس غیر معمولی بوجھ کو برداشت نہ کر سکے تو فرانسیسی حکومت نے روہر کے صنعتی علاقہ میں فوجیں بھیج کر اس جرمن صوبہ پر قبضہ کر لیا۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنوں کے جمہوری لیڈر جو فرانس اور انگلستان کے دوست تھے اور ان دونوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے قوم کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوگئے اور ہٹلر نے اس عام نفرت سے جو انگلستان اور فرانس کے خلاف جرمنوں میں پیدا ہوگئی تھی فائدہ اٹھا کر اُن میں مقبولیت حاصل کرلی ہٹلر نے برسر اقتدار آنے کے بعد جنگ کی تیاری شروع کی اور بالآخر فرانس کو شکست دے کر اسکی قومی طاقت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اگر فرانس اپنی دولت کے غرور اور فتح کی سرمستی میں اس پالیسی کے بعید تر نتائج کو فراموش نہ کر دیتا اور جرمنوں کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک کرتا تو شاید ہٹلر کو برسر اقتدار آنے کا موقع نہ ملتا۔ اسیطرح فرانسیسیوں نے رہائن لینڈ پر جرمن قبضہ کے وقت محض اس خوف سے فوجی کاروائی نہیں کی کہ مبادا اس سے جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں اور فرانس کو پھر ایکبار جان و مال کی قربانیاں دینی پڑیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ اور قریب آگئی اور ہٹلر نے یکے بعد دیگرے آسٹریا اور چیکوسلاوکیہ کا بھی

صفایا کر دیا فوری خطرات کا یہ غیر معمولی خوف اور فوری فوائد کی یہ غیر معمولی
محبت زوال آمادہ قوم کی ایک امتیازی صفت ہے جسکی طرف قرآن مجید نے
حسب ذیل آیت میں اشارہ کیا ہے۔

ان ھؤلاء یحبون العاجلۃ ویذرون یہ لوگ (یعنی کافر) جلد ملنے والے نفع سے محبت کرتے
وراءھم یوما ثقیلا۔ ہیں اور اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو چھوڑ دیتے ہیں

یعنی کفار زندگی کے معمولی مسائل پر جن سے ان کا فوری فائدہ وابستہ ہوتا ہے
بہت زیادہ متوجہ رہتے ہیں کیونکہ انہیں جلد ہاتھ آنے والے نفع سے بڑی محبت
ہوتی ہے لیکن اس پر غور نہیں کرتے ہیں کہ مستقبل کدھر جا رہا ہے اور انکے فوری
فوائد آئندہ قائم رہیں گے یا نہیں۔ مثلاً ایک چور بازاری کرنے والا تاجر یہ تو سمجھ
لیتا ہے کہ اسکو اس عمل سے اتنے لاکھ یا اتنے کروڑ کا فائدہ ہوگا لیکن اسے یہ فکر
نہیں ہوتی کہ اگر چور بازاری کی شدت سے تنگ آکر عوام کوئی انقلاب برپا کر دیں
یا کوئی دشمن ان حالات سے فائدہ اٹھا کر قوم کو شکست دے دے یا اسے اور کسی
بڑے نقصان میں مبتلا کر دے تو اس نفع سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ اسے ملیگا
یا نہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت جس میں بتایا گیا ہے کہ فوری نفع کی محبت کے
آگے تم اس عذاب کو بھلا بیٹھے ہو جو اس ذہنیت کے باعث لازماً نازل ہوگا
۱۹۱۴ء کے بعد کی انگریزی اور فرانسیسی سیاست پر حرف بہ حرف چسپاں ہوتی
ہے۔ ان دونوں قوموں نے رہائن لینڈ۔ آسٹریا چیکوسلاویکیہ منچوریا حبشہ اور
البانیہ کے معاملہ میں فوری فوائد کی خاطر اور فوری خطرات سے محفوظ رہنے کیلئے
سارے اصولوں۔ عہد ناموں اور ساری سیاسی ایمانداری کو بالائے طاق
رکھدیا اور اپنی بد اعمالیوں اور بے ایمانیوں سے ڈنکرک کے یوم ثقیل کو قریب تر
لے آئے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر رہائن لینڈ میں جرمن فوجوں
کے داخلہ کے وقت فرانس اپنی فوجیں مزاحمت کیلئے روانہ کر دیتا یا اگر حبشہ
کے معاملہ میں فرانسیسی اور انگریز اطالیہ کے خلاف تدارکات کا استعمال کرتے

تو ڈنکرک کا یوم ثقیل انہیں اتنی جلد نہ دیکھنا پڑتا۔

اسٹاوسکی کے واقعے نے فرانسیسی نظم ونسق اور فرانس کے سربر آوردہ طبقات کی اخلاقی کمزوریوں کا پردہ چاک کرکے دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ یہ قوم ملکی جذبات سے مغلوب ہو چکی ہے اور اسکے افراد میں روپیہ پیسہ اور دولت کی ہوس اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اسکے آگے وہ اخلاقی اصولوں۔ قومی مفاد اور اپنے ملک کی حفاظت وصیانت کو بھی قربان کر دینے پر آمادہ ہے ہٹلر کو فرانس کی ان کمزوریوں کا پورا پورا اندازہ تھا اور اسی وجہ سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ فرانس کے لوگ اپنی قوم کی حفاظت یا اپنے عہد ناموں کی پابندی کیلئے کوئی مالی یا جانی قربانی نہیں کر سکتے ہیں اگر اُسے ان باتوں کا احساس نہ ہوتا تو وہ رہائن لینڈ اور اسٹریا پر اس دیدہ دلیری سے قبضہ نہ کر لیتا جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے اسٹاوسکی اپنی لوٹ کھسوٹ میں اس وجہ سے کامیاب رہا کہ فرانسیسی حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں اور ارکان پارلمنٹ سے اس کی دوستی تھی اور یہ لوگ واقعات کو جانتے بوجھتے اپنے شخصی اور طبقاتی مفاد کی خاطر اسکی بدعنوانیوں پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ پھر فرانس کے محکمہ جات پولیس اور عدالت بھی اسکے خلاف کوئی کاروائی کرنے سے قاصر رہے کیونکہ اس نے رشوتیں کھلا کر پولیس اور عدالت کے عہدہ داروں کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ حالانکہ یہ سب لوگ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اسٹاوسکی کی سٹہ بازی اور فریب دہی سے نہ صرف قومی مفاد کو نقصان پہنچے گا بلکہ ہزاروں فرانسیسیوں کی معاش پر بھی ان کارروائیوں کی زد پڑے گی۔ کسی قوم کے افراد میں اسٹاوسکی جیسے انسانوں کا اس آزادی اور بے خوفی سے دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسکے معاشی اخلاق کو گھن لگ چکا ہے اور یہ یاد رہے کہ معاشی اخلاق

انسان کی مجموعی اخلاقی زندگی کا ایک حصہ ہے جس قوم کا معاشی اخلاق خراب ہو اسکی کل اخلاقی زندگی خراب ہو گی کیونکہ اخلاق کا ہر شعبہ دوسرے سے وابستہ اور اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اسٹاوسکی اور اس کے جیسے دوسرے فرانسیسیوں کی ذہنیت وہی تھی جس کا ذکر قرآن نے زوال پذیر قوموں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کیا ہے قوم مدین کو حضرت شعیب نے اسی ذہنیت پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ویقوم اوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسو الناس اشیاءھم اے قوم مدین ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم کرکے نہ دیا کرو۔

موجودہ زمانہ کی چوربازاری، سٹہ بازی اور دیگر معاشی بے ایمانیاں جنکی وجہ سے ایک شخص کا فائدہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے نقصان کا باعث ہوتا ہے اسی " لا تبخسوا الناس اشیاءھم " کے ذیل میں آتی ہیں اور ان کا وجود اور پھیلاؤ یہ ثابت کر رہا ہے کہ جو قومیں ان خرابیوں میں شدت سے مبتلا ہیں وہ قوم مدین کی طرح تباہی اور بربادی کی منزل سے قریب تر آگئی ہیں۔

فرانس کی طرح انگلستان اور امریکہ کے حالات سے بھی ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ انگریز اور اہل امریکہ بھی کم و بیش انہیں خرابیوں میں مبتلا ہیں جن میں فرانس کے باشندے مبتلا تھے یہ تمام خرابیاں جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں تخلیقی جذبات کی زیادتی اور تعمیری جوش کی کمی سے وجود میں آتی ہیں۔ ہم نے انگلستان اور امریکہ کے حالات میں یہ بتایا ہے کہ ان ملکوں کی بین الاقوامی سیاست جس محور پر گردش کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح کمیونزم کا توڑ کیا جائے اور روس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے یہ جذبہ ان ملکوں میں اس لئے پیدا ہوا کہ انہوں نے دنیا کی پسماندہ

قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر خوب دھن دولت جمع کر لی ہے۔ اب انہیں
خطرہ یہ ہے کہ روس کی کامیابی اور کمیونزم کے فروغ سے انکی اس
معاشی برتری اور اقتصادی عظمت کو اتنا بڑا دھکا پہنچے گا کہ ان کا
سارا مال و متاع اور ان کے تمام اسباب عیش اور وسائل زینت
ان سے چھن جائیں گے۔ اسی خطرہ نے ان کو اس بات پر آمادہ کر دیا
کہ یہ روس کے خلاف ہٹلر۔ مسولینی اور ٹوجو کی حوصلہ افزائی کریں۔
لیکن ان رجعت پسند اور جابر حکمرانوں کو روس کے خلاف کھڑا کر دینے
میں انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ ان کے اپنے اقتدار و طاقت کے
درپے ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر۔ مسولینی اور ٹوجو نے روس
سے ابھڑنے کے بجائے پہلے انگلستان۔ فرانس اور امریکہ سے ٹکر لی۔
اسطرح ان ممالک کی تدابیر الٹی پڑ گئیں اور انہیں کے لئے خطرہ کا
باعث بن گئیں اسی بد تدبیری اور غیر ایماندارانہ سیاست کو قرآن
مکر السیئ سے تعبیر کرتا ہے اور فرماتا ہے۔

لا یحیق المکر السیئ الا باھلہ جو لوگ بری تدابیر (مال و دولت یا اقتدار کی حفاظت
کیلئے) اختیار کرتے ہیں انکی تدابیر انہیں پر الٹ پڑتی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انگریز اور امریکہ کمیونزم کو توڑنے کیلئے اور کیا تدابیر اختیار
کرتے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اگر ان میں تعمیر و تخلیق کا جوش موجود ہوتا تو یہ اپنی فاضل
دولت اور غیر معمولی فنی ترقیوں کو پسماندہ اقوام کے ابھارنے اور ترقی دینے میں استعمال کرتے
اور اس طرح روس کے پروپاگنڈے اور کمیونزم کے نعروں کو شکست دے دیتے۔ اگر انہوں
نے کوئی ایسی ایجابی (   ) پالیسی اختیار کی ہوتی تو پسماندہ ممالک میں کمیونزم کا
چرچا نہ پھیلتا کیونکہ کمیونزم تو معاشی بے اطمینانی اور فاقہ زدگی سے پیدا ہوتی ہے جس ملک میں
طبقاتی بے اعتدالی اور ظلم کی حد تک نہ پہنچی ہو جہاں کے بالاتر طبقات کمزوروں اور غریبوں سے ناجائز
فائدہ حاصل کر کے ان پر ظلم و ستم نہ توڑتے ہوں جہاں معاشی اخلاق اور انصاف

کا معیار بلند ہو وہاں کمیونزم ایک روز بھی پنپ نہیں سکتی کمیونزم کی پیدائش اور فروغ کا سبب ہی یہ تھا کہ سرمایہ دار ممالک اور سرمایہ دار طبقات نے مال و دولت کی ہوس اور اقتدار کی حرص میں مبتلا ہو کر پسماندہ ممالک اور غریب طبقات کو لوٹنا اور کھسوٹنا شروع کر دیا اگر یہ صورت نہ ہوتی بلکہ سرمایہ دار ممالک اور طبقات اپنی زائد دولت کو تعمیری اور تخلیقی کاموں پر صرف کرتے رہتے اور اُس پر پسماندہ اقوام و طبقات کا حق تسلیم کر کے ان کی معاشی ترقی اور تعلیمی حالت کی اصلاح کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرتے تو روس میں بالشویک انقلاب رونما نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو روسی بالشویکوں کا پروپاگنڈا دوسرے ملکوں میں بے اثر رہتا۔ کمیونزم اور روسی اثر کے روز افزوں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک اور طبقات نے ان کے خلاف ایک منفی (Negative) طریق کار اختیار کیا ہے۔ اگر یہ لوگ کمیونزم کے خلاف پراپاگنڈا کرتے اور اسلحہ سازی اور فوجی تیاری پر روپیہ صرف کرنے کے ساتھ ساتھ محکوم قوموں کو آزادی دے دیتے۔ نیم آزاد قوموں مثلاً کوریا۔ فلپائن وغیرہ پر ظالمانہ حکومتوں کے تسلط کو برداشت نہ کرتے اور اپنا روپیہ پیسہ محض غیر ایماندارانہ سیاست پر نہ صرف کرتے بلکہ انسانیت دوستی اور تعمیر و تخلیق کے جذبہ سے متاثر ہو کر مفید انسانیت کاموں پر بھی اپنے معاشی وسائل کا کچھ حصہ لگا دیتے تو کمیونسٹ تحریک خود بخود فنا ہو جاتی۔ لیکن انہوں نے کمیونزم کی منفی مخالفت شروع کر دی اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے کوئی ایجابی (Positive) تدبیر نہ اختیار کی اس طرح انہوں نے اپنی بداعمالیوں اور غیر

ایماندارانہ سیاست سے کمیونزم کو خود ہی نشوونما اور ترقی کے وسائل فراہم کر دیئے۔ چین کی حالیہ تاریخ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔ امریکہ نے چیانگ کائی شک ( )
اور اس کی ظالمانہ حکومت کو قائم رکھنے کے لئے جسقدر بے اندازہ دولت اس کو اور اس کے حامیوں کو عنایت کی اور جتنا فوجی سامان ان کی مدافعت کے لئے روانہ کیا اس کا اثر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ کمیونسٹوں کو شکست ہو جاتی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ امریکہ کا سارا فوجی سازو سامان کمیونسٹوں کے ہاتھ لگا اور جتنا روپیہ امریکہ نے چیانگ کی حکومت کو دیا اس کا عوام کو کوئی فائدہ نہ پہنچا بلکہ وہ چیانگ کائی شک کی پارٹی کے چند سرمایہ داروں اور اس کی حکومت کے بعض عہدہ داروں کی جیبوں میں پہنچ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظالم حکومتوں اور غیر منصف مزاج پارٹیوں کو مدد دینا ایک بہت بڑا گناہ ہے جس کو قدرت برداشت نہیں کرتی کیونکہ اس سے انسانیت کو فائدہ کی جگہ نقصان پہنچتا ہے۔ امریکہ نے کمیونزم کی مخالفت میں یہ نہیں دیکھا کہ وہ کس قسم کے لیڈروں کو فوجی اور مالی امداد دے رہا ہے۔ للذا اس نے اپنی اندھی دشمنی اور غیر تخلیقی روش سے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری۔ امریکہ کے باشندوں پر تملیکی جذبات کتنے غالب ہیں اس کا حال ہمیں ان رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً امریکی سنات کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی طرف سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی چند رپورٹوں کا خلاصہ ہم گزشتہ صفحات میں درج کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے اسلحہ ساز کارخانہ داروں اور صنعت کاروں نے محض طبقاتی مفاد کی خاطر اپنے ملک کی پالیسی کو غلط راستہ پر ڈالنے

کی کوشش کی تاکہ جنگی تیاریوں کا زور و شور ہو اور ان کے بنائے ہوئے اسلحہ کے لئے ایک بڑا وسیع مارکٹ پیدا ہو جائے جس قوم کے لوگ اپنے شخصی اور طبقاتی مفاد کے آگے قومی مفاد کی پرواہ نہ کریں اور دیدہ و دانستہ ان نتائج سے آنکھیں بند کر لیں جو ان کے اعمال سے پیدا ہو سکتے ہیں اس کی فلاح و بہبود کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

ہماری اس بحث کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ قوموں پر زوال و انحطاط کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق حبّ الشہوت میں مبتلا ہو جاتی ہیں یعنی تعمیری جذبات اور تخلیقی جوش سے محروم ہو کر ان کے افراد تملیکی جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قومیں شعوری طور سے ان تمام خرابیوں کا مداوا کر سکتی ہیں یا وہ اپنے جذبات و خواہشات سے مجبور اور ان کے نتائج کی پابند ہیں۔ بالفاظ دیگر کیا قوموں کے تخلیقی جذبات اور ان کی تعمیری امنگوں کو شعوری طریقہ سے ترقی دی جا سکتی ہے اور ان کو تملیکی جذبات کے غلبہ سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے یا یہ سارا عمل ایک تاریخی وجوب کے طور پر واقع ہوتا ہے اور افراد اپنے ارادہ و اختیار سے قومی زوال و انحطاط کے عمل کو روکنے پر قادر نہیں ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ قومیں اپنی تقدیر کو اپنے ارادہ اور عمل سے بدل سکتی ہیں۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم — اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے آپ کو نہ بدلے

یعنی قوموں کو پہلے اپنے نفس اجتماعی میں خود تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے تب خدا انکی مدد کرے گا۔ اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ اگر کسی قوم کی صحیح رہنمائی کی جائے اور اس کے لیڈر یا حکمران یہ ارادہ کر لیں کہ وہ شخصی مثال

تعلیم و تربیت اور پروپاگنڈے ذریعہ قوم کے تعمیری جذبات اور تخلیقی امنگوں کو فروغ اور نشوو نمادیں گے اور اس کے تملیکی جذبات کو حد اعتدال سے آگے نہ بڑھنے دیں گے تو وہ اپنی قوم کو زوال و شکست سے بچا سکتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے کہ پہلے حکمران طبقات اور مالدار اشخاص خود اپنی زندگی میں اعتدال پیدا کریں اور زینت و آرائش عیش پرستی اور شہوت رانی کی عادات ترک کریں قوم کے سربرآوردہ طبقات میں اگر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے تو متوسط اور غریب طبقات پر اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ وہ بھی اپنے غلط طرز حیات۔ مسرفانہ عادات اور لذت پرستانہ رجحانات پر قابو حاصل کر لیں گے۔ یہ یاد رہے کہ عیش پرستانہ اور مسرفانہ عادات کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض افراد و طبقات کے قبضہ میں اتنی وافر زمین یا سرمایہ آجاتا ہے کہ انہیں حصول رزق کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی اور وہ گھر بیٹھے آرام و اطمینان سے اپنی زائد دولت یا زمین کی آمدنی سے اسراف و تعیش کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس لئے جو قوم اپنے معاشی نظام میں ایسے مفت خوروں کی رو رعایت کرتی ہے اور زائد زمین یا سرمایہ کو چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے دیتی ہے وہ درحقیقت اپنے زوال و انحطاط کا سامان خود ہی مہیا کرتی ہے ایک صحت مند اور ترقی پذیر معاشرہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی فرد کو بغیر محنت و مشقت اور بغیر جدوجہد کے آرام آسائش کی زندگی بسر کرنے کا موقعہ نہ دے۔

پھر دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا پورا نظام اسطرح وضع کیا جائے جس سے قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں زندگی کے متعلق صحیح عقیدہ اور رویہ پیدا ہو۔ اگر کسی ملک کا نظام تعلیم صحیح اصولوں پر مبنی ہو اور اس کے معلموں اور اساتذہ کی شخصی زندگی اس طرز کی ہو جس

سے تملیکی جذبات کے بجائے تعمیری اور تخلیقی جذبات ابھریں اور ترقی کریں تو وہ اپنی آئندہ نسل میں ایک طاقتور عقیدہ اور اخلاق پیدا کر سکتا ہے جس سے اس کے اندر معاشی دیانت۔ سیاسی ایمانداری اور عقل و فکر کی راستبازی کے صفات نشوونما پائیں گے۔ پھر اخبارات۔ ریڈیو اور نشرو اشاعت کے دوسرے طریقوں سے قوم کے تملیکی جذبات کو دبایا اور تعمیری صفات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی قوم ان خطوط پر کام کرنا شروع کرے تو دس پندرہ سال کی مختصر مدت میں وہ عرصہ دراز کی خرابیوں کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ بالخصوص مسلمان قوم پر اگر اس قسم کا عمل کیا جائے تو چونکہ اسکے اندر کسی نہ کسی درجہ میں اسلامی عقیدہ باقی اور موثر ہے اس لئے یہ قوم بہت تھوڑے عرصہ میں زوال و انحطاط کے بھنور سے نکل کر عروج و ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔